جناح، گاندھی اور سوشلزم
از
پریم ناتھ بزاز

جناح ـ گاندھی

اور

سوشلزم

پریم ناتھ بزاز

دار الشعور

اردو بازار لاہور

ایم حمزہ

نے زیڈ۔ آر پرنٹنگ پریس لاہور

سے چھپوا کر

شائع کی

قیمت =/80 روپے

فہرست مضامین

تعارف

ہندوستان کے سیاسی حلقوں میں کامریڈ پریم ناتھ بزاز کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ کی شخصیت ایک ایسی نڈر اور بے باک طبیعت کی مالک ہے جس میں شخص پرستی کے بدلے واقعیت پرستی کو سب سے اونچی جگہ حاصل ہے۔ ہمارے جیسے پسماندہ ملک میں جہاں ایک طرف ایسی شخصیتوں کا فقدان ہے وہاں ان کا وجود بے حد مغتنم ہے۔ آپ کے نزدیک وہ سیاسی سرگرمی سراسر بے مطلب ہے جس میں تواریخی واقعات کو جانچنے اور تولنے کے بدلے کورانہ تقلید کو دخل ہو۔

موجودہ جنگ نے دنیا کے سیاسی مفکرین کو ایک امتحان میں ڈال دیا ہے اور تمام ترقی پرور عناصر کو ایک دوراہے پر کھڑا کر دیا ہے۔ اس ذہنی بحران کی حالت میں ہر ایک سیاسی مفکر کے لئے یہ فیصلہ کرنا ناگزیر بن گیا ہے کہ وہ اس جنگ میں حقیقی ترقی کا معاون ہے یا رجعت پسندی کا۔ نظریے سرعت کے ساتھ بدل رہے ہیں۔ پرانے زاویوں کی جگہ نئے زاویئے لے رہے ہیں۔ اقدار کی اس باہمی ٹکر نے متخاصم عناصر کو نہ صرف جنگی محاذ پر بلکہ نظریاتی، فلسفی اور تخیلاتی میدان میں ایک دوسرے کے بالمقابل صف آراء کردیا ہے۔ زمانہ قبل از جنگ کے دیوتا راکھشس اور راکھشس دیوتا ثابت ہورہے ہیں۔ کامریڈ بزاز کی باغیانہ طبیعت بھلا اس داروگیر، اس کشمکش اور ہاتھاپائی میں کیونکر خاموش رہ سکتی تھی۔ عمر عزیز کے ایک حصہ کے لئے گاندھی ازم کی بھول بھلیاں میں غلطاں و پیچان رہنے کے بعد آپ نے ایک کروٹ لی اور خوب لی۔ اس میں کلام نہیں کہ گاندھیائی فلسفہ کے متعلق مدت سے آپ کے دل میں اہم شبہات تھے جن کا اظہار آپ "ہمدرد" کے کالموں میں کرتے رہے۔ لیکن مجموعی طور پر آپ بھی غالباً" اس خیال کے موید تھے کہ گاندھیائی طریق کار شاید ہندوستان کے موجودہ حالات کے پیش نظر نکما ثابت نہ ہو۔ لیکن آپ کی ذہن رسا نے وقت پر بھانپ لیا کہ "این راہ قومی روی بہ ترکستان است" اس موقعہ پر آپ کی واقعیت پرستی

آپ کے آڑے آئی۔ اور آپ نے سستی شہرت کے لالچ سے بے نیاز ہو کر کوتاہ بین نقادوں کی مخالفت کی مطلق پروا نہ کرتے ہوئے اپنے انقلابی فریضہ کو انجام دیا۔ یعنی یہ کہ اپنے ہر دلعزیز اخبار "ہمدرد" کے کالموں میں گاندھیائی فلسفہ کو بے نقاب کرکے اس کی رجعت پسندانہ نوعیت کو آشکارا کردیا۔

اس کتاب کے ابواب اسی سلسلہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ جو کامریڈ بزاز نے اس بحرانی دور میں لکھے۔ اور جو آپ کی حق پرستی اور انقلابی جرات کی آئینہ دار ہیں۔ ان مضامین میں کم و بیش ان تمام سیاسی اور فلسفی رجحانات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ نیز حقائق کی روشنی میں ان تمام دلائل کا موازنہ بھی کیا گیا ہے جو کہ اس مختصر سے عبوری دور میں حساس سیاسی کارکنوں کی پریشانی اور ذہنی الجھن کا موجب بنے رہے۔ کامریڈ بزاز نے اسی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ الجھن کا صحیح علاج بھی بتایا ہے۔

مجھے امید ہے کہ ہندوستانی نوجوانوں کے لئے اس کتاب کے مطالع سے وطنی سیاسیات کو سمجھنا آسان ہوگا۔

کنہیا لال کول

جنرل سیکریٹری کشمیر سوشلسٹ پارٹی

حرف اول

میں نے میدان سیاسیات میں پہلی بار ۱۹۳۰ء میں قدم رکھا۔ دوسرے ناتجربہ کار نوجوانوں کی طرح جن کے دل میں وطن کے عوام کی خدمت کا جذبہ موجود ہو میں نے بھی کانگریس کی پناہ لی۔ اور گاندھیائی قوم پرستی کو ملک کی آزادی کا ذریعہ تسلیم کیا۔ لیکن میری سیاسی زندگی کے شروع ہوتے ہی مجھے واقعات اور تجربہ سے محسوس ہونے لگا کہ گاندھی ازم میں نہ تو قوم پرستی موجود ہے نہ انقلاب پروری۔ میرے دل میں اس کی نسبت شبہات پیدا ہونے لگے۔ میرے شبہات اس وقت پختہ ہوئے جب ۱۹۳۴ء میں گاندھی جی نے مجھے سیاسیات کشمیر کے بارے میں وہ مختصر لیکن پر معنی چٹھی لکھی جس پر اس کتاب میں ایک جگہ بحث کی گئی ہے۔

۱۹۳۴ء سے مجھ پر گاندھی ازم کا طلسم نہ رہا۔ لیکن پھر بھی میری امیدیں کانگریس کے ساتھ برابر وابستہ رہیں۔ مجھے یقین تھا کہ کانگریس گاندھی نہیں ایک عظیم قومی تنظیم ہے جس میں سچے قوم پرست بھی موجود ہیں اور انقلاب پسند بھی۔ وہ گاندھی جی پر ایک نہ ایک دن ضرور غالب آئیں گے۔ افسوس! موجودہ جنگ سے پیدا شدہ حالات نے اس آرزو کو بھی خاک میں ملادیا۔ کانگریس نے بین الاقوامی بحران میں گاندھیائی قوم پرستی کے زیرِ اثر جمہور کی نمائندگی سے منہ موڑا۔ اور یہ قومی انجمن ہندو سرمایہ داروں کی ترجمان بن گئی۔

یہ مضامین جو اب کتابی صورت میں پیش کئے جا رہے ہیں ان ہی دنوں اخبار "ہمدرد" کے لئے لکھے گئے تھے جب مجھے کانگریس کی پالیسی اور پروگرام سے شدید اختلاف پیدا ہوا۔ اس خیال سے کہ ممکن ہے کہ ہندوستان کے مختلف اطراف میں رہنے والے کئی محب وطن اور جمہوریت پرست دوست بھی اسی تجربے کے درمیان سے گزر رہے ہوں جس سے گذرنے کا مجھے اتفاق ہوا۔ اور انہیں ان خیالات کے پڑھنے سے اپنا فیصلہ کرنے میں کوئی مدد مل سکے میں ان مضامین کو کتابی صورت میں پیش کر رہا ہوں۔

میں نے مضامین کو کتابی صورت میں پیش کرتے ہوئے ایسے ہی رہنے دیا ہے جیسے وہ "ہمدرد" میں شائع ہوئے تھے۔ گو اس سے کئی جگہ پر تکرار پیدا ہوگئی ہے۔ لیکن میری رائے ہے کہ تکرار کی وجہ سے مقصد کو سمجھنا آسان ہوگیا ہے اس لئے کسی تغیر و تبدل کی ضرورت نہیں۔

میں جانتا ہوں کہ کتاب میں جس موضوع پر اور جس نکتہ نگاہ سے بحث کی گئی ہے وہ ہمارے ملک میں اس وقت زیادہ ہردلعزیز نہیں۔ اس لئے کتاب کے پڑھنے والوں کی تعداد کثیر نہیں ہوسکتی لیکن میرے دل میں ذرہ بھر بھی شبہ نہیں کہ ہندوستانی عوام کی آزادی کا صحیح راستہ ہردلعزیزی کی خواہش کو پورا کرنے سے نہیں بلکہ مشکلات کا مقابلہ کرنے سے ڈھونڈا جاسکتا ہے۔

پریم ناتھ بزاز

۲۶ جنوری ۱۹۴۴ء

ہندوستانی سیاسیات میں انقلاب

بین الاقوامی حالات نے جہاں کئی پوشیدہ باتوں کو بے نقاب کیا وہاں ان حالات نے گذشتہ سال ہندوستانی سیاسیات کے بحران کو بھی نمایاں کردیا۔ بحران کے وقت ہر قوم کو فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ کس طرف ہے۔ میں نے بھی سوچا اور فیصلہ کیا۔ وہ فیصلہ کانگریس کی موجودہ رہنمائی کے خلاف تھا۔ میرے اس فیصلہ سے "ہمدرد" کی ایڈیٹوریل پالیسی پر بھی اثر پڑا۔ اور "ہمدرد" میں لازماً کانگریسی لیڈروں کے طریق کار کی شدید نکتہ چینی ہونے لگی۔ اور کانگریس کی حمایت کے لئے گنجائش نہ رہی۔ ۱۹۴۲ء کی کانگریسی تحریک اور مہاتما گاندھی کے برت کی نسبت جو رویہ میں نے اختیار کیا وہ بھی اسی فیصلہ کا نتیجہ تھا میں سمجھتا ہوں کہ میں اپنے سیاسی عقیدہ پر اب بھی اسی طرح کاربند ہوں جیسے پہلے تھا۔ میرا نصب العین وہی ہے جو اس بحران سے قبل تھا۔ اور میرا خیال ہے کہ جو دوست میرے مضامین کو بغور پڑھتے رہتے ہیں ان کو ایسا سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی ہوگی۔ لیکن کئی ایسے لوگ بھی ہیں جو یہ خیال کرتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے بلکہ میں نے اپنے سیاسی عقیدہ کو تبدیل کردیا ہے اور اسی لئے "ہمدرد" کی پالیسی بھی بدل گئی ہے۔ ان لوگوں میں زیادہ تر تعداد ان کی ہے جو آنکھیں بند کرکے مہاتما گاندھی کی پیروی کرنا اپنے لئے کافی سمجھتے ہیں یا کانگریس کی رہنمائی کو آمنا صدقنا کہتے ہوئے تسلیم کرتے ہیں۔ چاہے وہ غلط راستے پر ہو یا صحیح۔ گذشتہ چند مہینوں سے مجھے اس قسم کے خطوط موصول ہوتے رہے ہیں جن میں میرے خیالات اور "ہمدرد" کی پالیسی پر نکتہ چینی کی جاتی رہی ہے۔ میں ان کا ذاتی طور پر جواب بھی دیتا رہا ہوں اور جب ممکن ہوا۔ ان پر "ہمدرد" کے کالموں میں بلا واسطہ طور پر بحث بھی کرچکا ہوں۔ لیکن اب چند دوستوں نے مشورہ دیا ہے کہ اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ ایک بار بحث ہو تاکہ تمام شبہات دور ہوجائیں۔ اس مقصد کو مدنظر رکھ کر میں نے ضروری سمجھا کہ میں اپنے سیاسی عقیدہ اور "ہمدرد" کی ایڈیٹوریل پالیسی کو (جو حقیقتاً ایک ہی بات ہے) وضاحت کے ساتھ

بیان کروں۔ تاکہ دیکھا جاسکے کہ کیا ان میں سچ مچ کوئی تبدیلی ہوئی ہے یا نہیں۔

میرے سیاسی عقیدہ کو اگر مختصر طور پر بیان کیا جائے تو وہ یہ ہے کہ میں انسان کی آزادی کو سب سے پاک اور پوتر تصور کرتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ انسان کا حق ہے کہ دنیا کی ترقی سے فائدہ اٹھا کر اپنے لئے راحت میسر کرے۔ کسی بھی انسان کا حق نہیں کہ دوسرے انسان کی محنت اور مشقت کا استحصال کرے۔ ہر ایک کو اپنی محنت اور مشقت کا پورا ثمر ملنا چاہیے۔ انسان کی آزادی کے اسی اصول کے پیش نظر قوموں کو بھی آزاد ہونے کا حق حاصل ہے۔ اور ایک قوم کو دوسری قوم پر حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ خاص طور پر ذاتی تحقیق کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ دنیا میں اس قسم کا نظام صرف سوشلزم کے ذریعے سے ہی قائم ہوسکتا ہے ورنہ نہیں۔ اور اگر ہمیں اس کو قائم کرنا ہے تو ہمیں سوشلزم کا پرچار کرنا چاہیے۔

سائنٹیفک سوشلزم کا جنم داتا کارل مارکس تھا۔ اپنی کتابوں میں اس نے بتایا ہے کہ سوشلزم انقلاب کے ذریعہ سے ہی پھیلایا جاتا ہے۔اور جو لوگ سوشلزم کے ماننے والے ہوں وہ انقلاب پسند ہی ہوسکتے ہیں اور ہرگز نہیں۔

انقلاب کس کو کہتے ہیں؟ عام لوگوں کے سامنے انقلاب کا مطلب نراج (انارکی) ہے۔ ہندوستان کے رومان طبع نوجوان سمجھتے ہیں کہ انقلاب ایک قسم کی افراتفری ہے۔ لوٹ مار' غارت گری کو انقلاب کہتے ہیں۔ یہ سب غلط ہے۔ انقلاب کا مطلب ہرگز یہ نہیں۔ یہ نام اس کو مخالفین انقلاب نے دے رکھا ہے تاکہ انقلاب کو بدنام کرکے اس کے خلاف جذبہ پیدا کیا جائے۔ اور ان لوگوں کو بھی اس سے بدظن کرایا جائے جن کی زندگی کے لئے انقلاب ضروری ہے اور جو اس سے مستفید ہوسکتے ہیں۔

انسان ایک سماجی حیوان ہے۔ یعنی اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ رہ کر اپنی ضروریات زندگی حاصل کرے۔ حیوانوں اور انسانوں میں یہ فرق ہے کہ حیوان قدرت کے خلاف لڑ کر اپنی ضروریات زندگی کو پیدا نہیں کرسکتے۔ بلکہ مجبوراً جو کچھ ان کو ملے اسی پر قناعت کرتے ہیں۔ انسان کی حالت اس سے مختلف ہے۔ وہ قدرت پر قابو پانا چاہتا ہے اور پاتا رہا ہے۔ اور اس سے اپنی ضروریات زندگی حاصل کرتا ہے۔ جتنا انسان قدرت پر قابو پائے اتنا ہی وہ مہذب بن جاتا ہے۔ اور راحت حاصل کرتا ہے۔ قدرت کے

خلاف اس لڑائی میں انسان ایک دوسرے کے مددگار بنتے ہیں اس لئے ان کو ایک دوسرے کے ساتھ سماجی تعلقات پیدا کرنے پڑتے ہیں۔ یہ تعلقات زمانہ کی ترقی کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ اگر یہ نہ بدلتے تو دنیا کی ترقی ناممکن ہوجاتی۔ اور انسان جیسے آج سے ہزاروں سال پہلے تھا آج بھی اسی حالت میں ہوتا۔

کارل مارکس نے انسان کی تاریخ کو پانچ حصوں میں منقسم کیا ہے۔

(۱) ابتدائی اشتراکیت۔

(۲) غلامانہ سماج۔

(۳) زمیندارانہ دور۔

(۴) سرمایہ دارانہ کارنامہ۔ (۵) اشتراکی نظام یعنی سوشلزم۔

ان پانچوں دوروں میں انسانوں کے باہمی تعلقات مختلف رہے ہیں۔ ابتدائی اشتراکیت میں ان کے جو تعلقات تھے ان کی بناء پر انسانی سماج بہت عرصہ تک چلتا رہا۔ انسان نے ترقی کی اور یہ تعلقات قائم نہ رہ سکے۔ اس لئے ضروری ہوا کہ یہ بدل جائیں تاکہ دنیا مزید ترقی کرے۔ چنانچہ وہ تعلقات ٹوٹ گئے اور دنیا نئے سماج میں داخل ہوئی۔ نئے تعلقات قائم ہوئے۔ کچھ مدت کے بعد وہ بھی فرسودہ ہوگئے۔ اور نئے سماج نے جنم لیا اور اس طرح یہ سلسلہ ایک کو ہٹانے اور دوسرے کو قائم کرنے کے لئے جاری رہا۔

لیکن یہ سلسلہ امن اور شانتی کے ساتھ نہ چلا۔ کیونکہ جب ایک دور فرسودہ ہوجاتا ہے اور اس کو مٹانا انسان کی ترقی کے لئے ضروری ہوجاتا ہے تو دنیا انقلابی دور سے گذرنے لگتی ہے۔ کیونکہ وہ لوگ جو فرسودہ دور کے تعلقات سے فائدہ اٹھاتے تھے نہیں چاہتے کہ یہ دور ختم ہو۔ اس لئے وہ اس فرسودہ دور کو ہی زندہ رکھنے کی انتہائی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے خلاف وہ لوگ جن کی زندگی اس فرسودہ دور میں ناقابل برداشت ہوجاتی ہے اور جو یہ دیکھتے ہیں کہ سماج کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ نیا دور آوے۔ وہ فرسودہ دور کو ختم کرنے کے لئے اپنی تمام قوت صرف کرتے ہیں۔ نتیجہ کے طور پر طبقاتی کش مکش شروع ہوجاتی ہے جس میں جلد یا بدیر وہ لوگ کامیاب ہوجاتے ہیں جو فرسودہ دور کو مٹانا چاہتے ہیں۔ اسی کا نام انقلاب ہے۔ اور اس جدوجہد میں جو دو طبقے شریک ہوتے ہیں ان میں اول الذکر طبقے کو یعنی جو پرانے فرسودہ نظام کو قائم رکھنا چاہتا ہے۔ رجعت پسندانہ اور موخر الذکر کو جو نیا دور لانا

چاہتا ہے ۔ ترقی پسندانہ طبقہ کہتے ہیں۔ آج سے چار سو سال قبل دنیا میں زمیندارانہ دور چل رہا تھا۔ لیکن وہ فرسودہ ہوگیا کیونکہ دنیا میں کارخانہ جات کھلنے کی بدولت سرمایہ داری کا آغاز ہوا۔ وہ لوگ جو زمیندارانہ دور اور اس کے سماجی تعلقات کو قائم رکھنا چاہتے تھے رجعت پسند تھے۔ اور وہ لوگ جو اس دور کو مٹا کر سرمایہ داری کو لانا چاہتے تھے ترقی خواہ انقلاب پسند تھے۔ کیونکہ اگر دنیا کو ترقی کرنی تھی تو اس کے لئے ضروری تھا کہ کارخانوں کو وسعت حاصل ہو اور سرمایہ داری پھیلے۔ سرمایہ داری نے تین سو سال تک ترقی کی۔ اس کے بعد وہ بھی فرسودہ ہوگئی اور انسانی سماج کی مزید ترقی کے لئے ضروری ہوا کہ سوشلزم قائم ہو ۔ وہ لوگ جو اب اس فرسودہ نظام یعنی سرمایہ داری کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں رجعت پسند ہیں اور جو اس نظام کو مٹا کر اس کی جگہ اشتراکیت یا شوشلزم پھیلانا چاہتے ہیں وہ ترقی خواہ اور انقلاب پسند ہیں چاہے وہ امن و امان کے ساتھ صرف اپنے خیلات ہی کیوں نہ پھیلاتے ہوں۔

انقلاب پسند اکثر اوقات مجبور ہوجاتے ہیں کہ پرانے فرسودہ نظام کا خاتمہ کرنے کے لئے تشدد سے کام لیں۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہیے جیسا کہ اکثر نکالا جاتا ہے کہ جہاں طبقاتی کش مکش میں تشدد دکھائی دے وہ انقلاب کی نشانی سمجھی جائے۔ ایسا سمجھنا غلط ہے کیونکہ دنیا کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ خلاف انقلاب رجعت پسندوں نے بھی اپنے فرسودہ نظام کو زندہ رکھنے کے لئے تشدد سے کام لیا ہے۔ ہمیں تحقیق کرنی چاہیے کہ تشدد کرنے والوں کا مدعا کیا ہے؟ اگر مقصد یہ ہے کہ پرانے فرسودہ نظام کو قائم رکھا جائے تو یہ رجعت پسندوں کا تشدد ہے۔ اس لئے انقلاب کی نشانی نہیں بلکہ سچے انقلاب کی مخالف ہے۔ اگر تشدد کا مطلب پرانے سماج کو مٹا کر نئے ترقی پرور نظام کو قائم کرنا ہے تو تشدد فی الواقع انقلاب ہے اور انقلاب لانے کے لئے عمل پذیر ہے۔

متذکرہ الصدر وضاحت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں ہر وقت انسانی سماج کے دو ہی طبقے ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو رجعت پسند ہیں اور دوسرے وہ جو ترقی پرور اور انقلاب پسند ہیں ۔ تیسرا کوئی طبقہ موجود نہیں۔ کوئی انسان بالکل بے تعلق یا غیر جانبدار بھی نہیں رہ سکتا۔ وہ یا تو ایک طرف ہے یا دوسری طرف۔ امن کے زمانے میں کوئی آدمی بظاہر غیر جانب دار رہ سکتا ہے۔ لیکن جب کوئی سیاسی یا سماجی بحران آتا ہے تو اس کو ایک یا دوسری طرف

جانا پڑتا ہے۔ وہ یا تو رجعت پسند طبقے کے ساتھ رہتا ہے یا ترقی پرور طبقے کے ساتھ ہولیتا ہے۔

دنیا ایک وسیع جگہ ہے۔ کوئی چھوٹی بستی نہیں۔ انسانی سماج روئے زمین کے ہر حصے میں پھیلا ہوا ہے اور اس نے مختلف جگہوں پر مختلف حالات میں ترقی پائی ہے۔ اس لئے گو کارل مارکس کے متذکرہ الصدر پانچ دوروں کا اطلاق کم و بیش ہر ملک پر ہوتا ہے لیکن کہیں تو جلدی سے ترقی ہوتی ہے۔ کہیں لوگ پس ماندہ رہتے ہیں۔ گو ایک قوم کی ترقی کا اثر دوسری قوموں پر خواہ مخواہ پڑتا ہی رہا ہے۔ تاہم مختلف ملکوں میں انقلابی جدوجہد نے مختلف صورتیں اختیار کرلی ہیں اس لئے ضروری ہے کہ جب کوئی انقلاب پسند اپنے ملک میں ترقی پرور تحریک چلائے تو اس کو دیکھنا چاہیے کہ اس کے اپنے ملک کے حالات کیسے ہیں۔ وہ کسی دوسرے ملک کی کورانہ نقل نہیں کرسکتا۔ اگر وہ ایسا کرے تو کہا جائے گا کہ وہ انقلاب پسند احمق اور نالائق ہے۔ اس کی تحریک یقینی طور پر ناکام ہی رہے گی۔ اس کو اپنی تحریک اپنے ملک کے ماحول کے مطابق چلانی چاہیے۔ لیکن اسے ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ وہ کسی طرح دنیا کے ترقی پرور عناصر کے خلاف تو نہیں جاتا۔ اس کو کبھی اپنے ملک کے سماجی اور سیاسی کام میں پڑ کر دنیا کے حالات کی رفتار سے آنکھیں بند نہ کرنی چاہئیں۔ یہ سب سے بڑی احتیاط ہے کیونکہ انسانی سماج دنیا کے مختلف ممالک پہاڑوں' براعظموں اور سمندروں کی تقسیم کے باوجود ایک ہے۔

کسی ملک میں انقلاب کی فتح کے لئے دو باتیں ضروری ہوتی ہیں۔ ایک خارجی یعنی (Objective) اور دوسری باطنی یعنی (Subjective) خارجی کا مطلب یہ ہے کہ کیا اس ملک میں اقتصادی' سیاسی اور سماجی حالات ایسے پیدا ہوگئے ہیں کہ وہاں انقلاب آسکتا ہے۔ یعنی وہاں کا سماجی نظام اتنا فرسودہ ہوچکا ہے کہ پرانے طریق حیات سے اب کام نہیں چل سکتا اور نئے تعلقات کو قائم کرنا ضروری ہوگیا ہے۔ باطنی کا مطلب یہ ہے کہ کیا وہاں ایسی جماعت پیدا ہوگئی ہے جو یہ بخوبی جانتی ہو کہ انقلاب ہونا چاہیے۔ لفظ بخوبی کو اچھی طرح سمجھ لیجئے۔ انقلاب پسند رومانی خیالات کا نہیں ہونا چاہیے بلکہ انقلاب کے مفہوم سے اچھی طرح واقف ہونا چاہیے۔ اگر ان دو باتوں میں سے کسی ملک میں ایک موجود نہ ہو تو انقلاب کا کامیاب ہونا ممکن نہیں۔ ہندوستان میں خارجی حالت (Objective Condition) پوری

طرح موجود ہے۔ لیکن باطنی حالت (Subjective Condition) موجود نہیں اسی نے ہمارے سیاسی مسئلہ کو پیچیدہ بنادیا ہے۔ اور اس میں گانٹھ پر گانٹھ پڑ گئی ہے۔

ہندوستان ایک پسماندہ ملک ہے - یہاں کا انسانی سماج ابھی اکثر باتوں میں زمیندارانہ دور (Feudal Period) سے ہی گذر رہا ہے۔ لیکن دنیا میں سرمایہ دارانہ دور چل رہا ہے۔ اس لئے یہ ممکن نہ تھا کہ ہندوستان اس سرمایہ دارانہ دور کے اثرات سے بچا رہتا۔ اپنی پسماندگی کے ہوتے ہوئے جب یہ سرمایہ دارانہ دور کے زیر اثر آیا تو اس کو سامراج کے ماتحت ہونا پڑا۔ برطانوی سامراج گذشتہ ڈیڑھ سو سال سے ہندوستان کو چوس رہا ہے۔ اقتصادی طور پر ہندوستانی قوم گداگر بن چکی ہے۔ سیاسی طور پر ہم دبے ہوئے ہیں۔ روحانی طور پر ہم ذلیل ہوچکے ہیں۔ کیوں؟ صرف اس لئے کہ ہم برطانوی سامراج کے ماتحت ہیں۔ جب ہم اس حالت سے گذر رہے تھے دنیا میں انقلاب آنا شروع ہوا۔ سرمایہ دارانہ نظام فرسودہ ہوگیا اور یہ لازمی ہوگیا کہ اس نظام کو مٹا کر نئے بہتر نظام یعنی سوشلزم کو جنم دیا جائے۔ اس انقلاب کا آغاز یورپ میں ہوا۔ کیونکہ وہاں ہی سرمایہ داری نے بے حد ترقی بھی کی تھی۔ لیکن جیسا کہ میں نے اوپر لکھا دنیا کے ہر ایک انسان کو اس انقلاب میں اپنے اپنے ملک کے ماحول کے مطابق حصہ لینا تھا۔ ہندوستان نے بھی اس میں لازماً حصہ لیا۔ یہاں بھی ایک انقلابی تحریک چل پڑی جیسا کہ چلنی چاہیے تھی۔ یہاں اس تحریک نے قومی جدوجہد کی صورت اختیار کی۔ ہندوستانی ترقی پسند انقلاب پرستوں نے کہا کہ ہندوستان کو برطانوی سامراج سے آزاد کردینا چاہیے۔ عیاں ہے کہ یہ تحریک یورپ اور دنیا کی اس تحریک کا حصہ تھی جو انسانی سماج کو رجعت پسندوں کی گرفت سے آزاد کرانا چاہتی تھی۔

گذشتہ پچاس سال میں دنیا کی انقلابی تحریک نے ترقی کی۔ اس لئے ہندوستان کی قومی تحریک نے بھی تقویت پائی۔ پچھلے بیس سال سے ہماری تحریک کے رہنما مہاتما گاندھی رہے ہیں۔ مہاتماجی نے اس تحریک کو بہت وسیع کردیا۔ اپنی قابلیت، ایمانداری اور انتھک کارکردگی کی بدولت انہوں نے جمہور کو ہنگامی طور پر بیدار کردیا۔ لیکن اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کرسکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس تحریک کے رہنما ہوکر بھی اپنے فلسفہ حیات اور اقتصادی پروگرام کی بدولت رجعت پسند ہیں۔ ہندوستانی انقلاب تب کامیاب ہوسکتا ہے جب اس کا بنیادی فلسفہ یہ ہو کہ زمینداری، جاگیرادی اور سرمایہ داری کا دور ختم کیا جائے۔ ہمیں

اسے دفنانا ہے زندہ نہیں چھوڑنا ہے۔ بلکہ ان کی جگہ نیا اشتراکی نظام یعنی سوشلزم قائم کرنا ہے۔ اور ہندوستانی سماج کو اس ترقی سے فائدہ پہنچانا ہے جو روئے زمین کے دوسرے ترقی پرور ملکوں میں انسان نے کی ہے۔ لیکن مہاتما جی اس عقیدے کے قائل نہیں۔ وہ اپنی سکیم میں راجوں' مہاراجوں اور سرمایہ داروں کو بھی رکھنا چاہتے ہیں۔ بلکہ ان کو قومی دولت اور دنیاوی ثروت حوالے کرکے انہیں عوام کا امانت دار بنانا چاہتے ہیں۔ وہ مشین کے خلاف ہیں۔ وہ سائنس کی ایجادات کو بری نگاہ سے دیکھتے ہیں اور پیچھے مڑ کر ہندوستان میں آج سے چار ہزار سال قبل کا نظام یعنی رام راجیہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے اوپر دیکھا۔ یہ ترقی پسندی اور انقلاب پروری نہیں بلکہ رجعت پسندی ہے۔ اور اگر کسی انقلاب کا راہنما ان خیالات کا علمبردار ہو تو وہ انقلاب کو درہم برہم ہی کرسکتا ہے۔ اور قوم کو ترقی کی راہ پر نہیں تنزل کے گڑھے کی طرف لے جاسکتا ہے۔ ہمارے ملک کی سیاسی تحریک کی گذشتہ تاریخ سے دیکھا جاسکتا ہے کہ مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں کئی دفعہ ایسا ہوا بھی ہے۔ پھر بھی ہندوستان نے مہاتما جی کو اپنا رہنما مانا۔ کئی انقلاب پسند بھی ان کا ساتھ دیتے رہے کیوں؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ:

اول مہاتما جی نے ہندوستانی جمہور کو ہنگامی طور پر بیدار کیا جو ان سے پہلے کسی نے نہ کیا تھا۔

دویم انہوں نے قومی تحریک میں اجتماعی زندگی پیدا کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سماجی طور پر رجعت پسند ہونے کے باوجود مہاتما جی سیاسی طور پر سرمایہ دارانہ سامراج کے مخالف رہے۔ یہ ایک تضاد ضروری تھا۔ اور تاڑنے والے محسوس کر رہے تھے کہ جس شخص کے سماجی خیالات رجعت پسندانہ ہوں وہ سیاسیات میں زیادہ دیر ترقی پسند نہیں رہ سکتا۔ اور بحران کے وقت دنیا کے رجعت پسندوں کی ہی حمایت کرسکتا ہے ترقی پسندوں کی نہیں۔ انہیں خطرہ تھا کہ وقت آنے پر گاندھی جی اہم ترین اور خطرناک غلطی کرسکتے ہیں۔ گذشتہ بیس سال کے اندر ہندوستانی انقلاب پسند اپنے ان خدشات کا اظہار بھی کرتے رہے۔ لیکن پھر بھی چونکہ کوئی بڑا بھاری بحران نہ آیا تھا اور گاندھی جی جمہور کے دلوں میں جگہ کرچکے تھے۔ اس لئے معاملہ کو نظرانداز کرلیا گیا۔ اور گاندھی جی کی رہنمائی قائم رہی۔

سرمایہ دارانہ نظام اب فرسودہ ہی نہیں بلکہ اس کی زندگی کی شمع ٹمٹما رہی ہے۔ یہ

موت کی ہچکیاں لے رہا ہے۔ اس لئے اس کے فدائی اور محافظ یعنی سرمایہ دار اس کو بچانے کے لئے کوششیں کر رہے ہیں۔ ادھر سے ترقی پرور لوگ بھی محسوس کر رہے ہیں کہ جب تک اس نظام کا خاتمہ نہ ہوگا دنیا کے کروڑوں انسان کسی قسم کی ترقی کرنے کے بجائے بہت ہی بری طرح زندگی گذاریں گے۔ اس لئے انقلاب کے ذریعہ اس نظام کا خاتمہ کرنا ضروری ہے۔ پچھلی جنگ کے ساتھ ہی روس میں اس نظام کا خاتمہ کردیا گیا۔ اور وہاں اشتراکی نظام نے جنم لیا۔ اس سے دنیا کے انقلاب پسندوں کو تقویت حاصل ہوئی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی سرمایہ داروں کا طبقہ بھی بیدار ہوا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ دنیا میں دوسری جنگ ہو۔ اور اس کے ذریعہ سوشلزم روس کی طرح دوسرے ملکوں میں بھی پھیلے۔ حق تو یہ ہے کہ سرمایہ داروں کے لئے "نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن" کا مصداق تھا۔ وہ نہ تو انقلاب پسندوں کے خلاف جنگ جاری کرنا چاہتے تھے نہ ان کو کھلی ڈور دینا چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے ابی سینیا کو اٹلی کا شکار بنتے دیکھا۔ چین کو شکار بنتے دیکھا لیکن ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اور یہی کوشش کی کہ جنگ نہ پھیلنے پائے بلکہ جہاں آگ لگے وہیں بجھ جائے تاکہ سوشلزم کو وسعت حاصل نہ ہو لیکن یہ علاج کب تک کارگر ہوسکتا تھا۔ بین الاقوامی حالات کو کب تک قابو میں رکھا جاسکتا تھا۔ آخر کار نازک وقت آہی گیا۔ بین الاقوامی طبقاتی کشمکش شروع ہوگئی۔ اور اس نے موجودہ جنگ کی صورت اختیار کی جس میں ایک طرف رجعت پسند رہے جو مرتے ہوئے سرمایہ دارانہ نظام کو کسی طرح بھی زندہ رکھنا چاہتے تھے۔ اور دوسری طرف وہ تمام طاقتیں جمع ہونے لگیں جو اس نظام کو ہٹا کر اس کی جگہ نئے بہتر نظام یعنی سوشلزم کو قائم کرنا چاہتی تھیں۔ رجعت پسندوں کا عقیدہ فاشزم ہے اور انقلاب پسندوں کی رہنمائی وہ لوگ کر رہے ہیں جو فاشزم کو مٹانا چاہتے ہیں۔ بحران کی ابتداء میں اس طبقاتی کشمکش کو جانچنے کے لئے کچھ دقت محسوس ہوئی تھی۔ سوشلسٹوں میں کئی ایسی جماعتیں تھیں جو یہ نہ دیکھ سکیں کہ یہ جنگ سامراجیوں کی جنگ نہیں بلکہ ایک طبقاتی کشمکش ہے عوام کی جنگ ہے اور انسان کے لئے نئے سماج کو قائم کرنے کی غرض سے ہو رہی ہے۔

اس جنگ میں اب بالواسطہ یا بلاواسطہ دنیا کے تقریباً تمام ممالک اور تمام قومیں شریک ہوچکی ہیں۔ اس جنگ کی دو خصوصیات کی طرف توجہ دینا لازمی ہے۔ اول یہ کہ گو یہ جنگ قوموں اور ملکوں کے درمیان ہورہی ہے۔ لیکن یہ سابقہ جنگوں کی طرح نہیں۔ جو بادشاہوں

اور حکومتوں کے درمیان لڑی جاتی تھی۔ یہ جنگ عقائد کی جنگ ہے۔ اس کا مقصد پرانے سماج کو ختم کر کے نئے سماج کو لانا ہے۔ اس لئے ایک طرف تو وہ حکومتیں ہیں جو پرانے فرسودہ سماج کو زندہ رکھنا چاہتی ہیں۔ دوسری طرف وہ ہیں جو اس کو ختم کر کے نئے نظام کو قائم کرنا چاہتی ہیں۔ اس جنگ کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ گو مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ فلاں ملک اور فلاں قوم فاشسٹ ہے یا انقلاب پسند ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس ملک یا قوم میں رہنے والے تمام لوگ انقلاب پسند یا رجعت پسند ہیں۔ مثلاً" جرمنی فاشسٹ یعنی رجعت پسند ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر ایک جرمن فاشسٹ یعنی رجعت پسند ہے اسی طرح اگر برطانیہ جمہوریت پسند ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہاں کوئی فاشسٹ ہی نہیں۔ اور تمام انگریز انقلاب پسند ہیں۔ صرف روس ہی کے تمام کے تمام لوگوں نے اشتراکیت کو اپنایا ہے۔ اس جنگ کے شروع ہونے پر جہاں قوموں کو ایک دوسرے کے ساتھ لڑنا پڑا وہاں ہر ایک سرمایہ دارانہ ملک میں اندرونی کشمکش بھی شروع ہوگئی۔ اور ہر ایک ملک میں رجعت پسند اور انقلاب پرور آپس میں نبرد آزما ہونے لگے۔ جنگ سے قبل یہ بتانا مشکل تھا کہ کس سرمایہ دار ملک میں رجعت پسندوں کی زیادہ تعداد تھی۔ اور کس میں کم۔ لیکن جب موجودہ بین الاقوامی بحران آیا اور جنگ شروع ہوئی تو حالات صاف ہونے لگے اور جہاں رجعت پسندوں کی زیادتی تھی وہ ملک فاشزم کی طرف سرعت کے ساتھ جانے لگا اور جہاں انقلاب پسندوں کی اکثریت تھی وہ جمہوریت پسندوں یعنی سوشلسٹوں کی طرف دوڑنے لگا۔ اور بالاخر ان کے ساتھ مل گیا۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک دفعہ کہا کہ یہ جنگ بڑا بھاری انقلاب ہے۔ اس میں انقلابوں کے سمندر آرہے ہیں۔ اس میں محیرالعقول باتیں ہورہی ہیں۔ یہ بالکل صحیح ہے۔ اس جنگ میں دو باتیں ایسی ہوئیں۔ جو ہم ہندوستانیوں کے لئے سب سے بڑی اہمیت رکھتی تھیں۔ اور جنہوں نے ہمارے پالیٹکس کو بالکل بدل ڈالا۔ اس لئے اس کو جاننا ہر ایک محب الوطن ہندوستانی کے لئے اور ہر ایک انقلاب پسند کے لئے لازمی ہے۔ وہ دو باتیں یہ ہیں۔ اول ہندوستانی قومیت نے مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں رجعت پسندی کا رخ کیا۔ اور دنیا کے ترقی پرور اور انقلاب پسند عناصر کو امداد دینے کے بدلے بلا واسطہ طور پر فاشزم کی حمایت شروع کر دی بین الاقوامی بحران نے کانگریسی لیڈروں کو جو گاندھی پرست تھے گمراہ کردیا۔ اور

وہ نہ دیکھ سکے کہ انہیں اس بحران میں باقی باتوں کو بھول کر دنیا کے سماجی انقلاب کی حمایت کرنی چاہیے۔ وہی طرز عمل ان کو آزادی دے سکتا ہے۔ بحران آنے تک تو وہ برطانوی سامراج کو بجا طور پر کوستے رہے کہ اس نے ابی سینیا۔ سپین اور چین کو مدد نہ دے کر دنیا کے عوام کے ساتھ غداری کی۔ یہ بھی کہا کہ اگر برطانوی حکومت ان مظلوم قوموں کی حمایت کرتی تو کانگریس ان کو مدد دیتی۔ لیکن جب بالاخر برطانوی حکومت نے ایسا کیا تو خود ناشایان پوزیشن اختیار کی۔ یعنی کانگریس آہستہ آہستہ فاشزم کی طرف جھکنے لگی۔ کانگریس کی یہ حالت بلا وجہ نہ ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کانگریس گاندھی ازم کے اثر میں ہے۔ اوپر بتایا گیا ہے کہ گاندھی ازم کا فلسفہ حیات رجعت پسندانہ ہے۔ وہ سماج میں انقلاب نہیں چاہتا۔ وہ انسانی ترقی کی تاریخ میں آگے کی طرف نہیں پیچھے کی طرف دیکھتا ہے۔ وہ جاگیرداروں۔ زمینداروں اور سرمایہ داروں کے خلاف نہیں۔ صرف سیاسیات میں گاندھی ازم کا رویّہ قدرے ترقی پرورانہ تھا۔ کیونکہ یہ چاہتا تھا کہ غلام ہندوستان کو برطانوی سامراج آزاد کردے۔ آزاد کرنے کے بعد کیا ہوگا کیا ہندوستان کے عوام ہندوستانی جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے غلام بنے رہیں گے۔ یا سچ مچ آزاد ہوں گے۔ کانگریس کو اس کا کوئی خاص خیال نہ تھا لیکن جہاں تک مہاتما جی کے فلسفہ حیات کا تعلق ہے اس سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ ان کے اصول کے مطابق ہندوستان کی آزادی کا مطلب یہ ہے کہ اس ملک کو جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے حوالے کیا جائے گا۔ گاندھی ازم کے سماجی فلسفہ اور سیاسی پروگرام کے درمیان یہ شدید تضاد تو اس وقت تک چھپا رہا جب تک بین الاقوامی بحران نہ آیا تھا لیکن جب یہ بحران آگیا تو کانگریس کے لئے فیصلہ کرنا ضروری ہوا کہ اب وہ کدھر جائے۔ اگر وہ سوشلزم کے ساتھ مل جاتی تو اس کا مطلب یہ تھا کہ گاندھی جی کے فلسفہ حیات کو رد کردیا جائے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے ایسی ہی خفیف سی کوشش کی، لیکن وہ ناکام رہے۔ کیونکہ کانگریس کے اندر گاندھی پرستوں کی اکثریت تھی۔ ان کا بول بالا تھا۔ اس لئے ان کی کوشش ناکام رہنی ضروری تھی۔ لہٰذا قدرتی طور پر کانگریس فاشزم کی طرف جانے لگی۔ ہاں زبانی دعوی تو پھر بھی ہوتا رہا کہ کانگریس ترقی پرور عناصر کے ساتھ ہے۔ جمہوریت پرور ہے۔ لیکن عمل سے جو اقدام کیا گیا وہ فاشزم کو امداد دیتا گیا۔ یہی وجہ بھی تھی کہ ہندوستانیوں کی مجموعی ذہنیت فاشسٹ پرست بن گئی اور جہاں دیکھو ہندوستانی ریڈیو پر جرمنوں کی فتوحات سن

کر خوش ہوتے رہے۔ یہ تو ہوئی پہلی اہم بات۔

اب جنگ کی دوسری اہم بات سنئے۔ وہ یہ کہ برطانیہ کے لوگوں میں ترقی پرور اور انقلاب پسند عنصر کا غلبہ ہوا۔ اور برطانوی حکومت کو اس غلبہ کے زیر اثر فاشزم کے خلاف رہنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ برطانوی حکومت سامراجیوں اور سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں تھی لیکن وہ بے بس تھے۔ اپنے ملک کی سماجی حالت کو دیکھ کر انہیں فاشزم کے خلاف فیصلہ کرنا پڑا۔ یعنی برطانوی حکومت انقلاب پسند ہوگئی۔ اور اس نے پرانے فرسودہ سماج کے فنا کرنے اور نئے بہتر سماج (سوشلزم) کو قائم کرنے کے لئے دنیا کے ترقی پرور عناصر کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ یہ صحیح ہے کہ برطانوی حکومت کے سرمایہ دار مالکان نے ایسا جان بوجھ کر نہیں کیا۔ وہ باطنی طور (Subjectively) پر دل سے انقلاب پسند نہیں بنے۔ وہ بسا اوقات اپنی موجودہ حالت کو پسند بھی نہیں کرتے تھے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا جبکہ وہ خارجی طور پر (Objectively) انقلاب پسندوں کا کام کر رہے ہیں۔ اور جوں جوں وہ اس طرف آگے بڑھتے ہیں توں توں وہ زیادہ انقلاب پسند بنتے جاتے ہیں۔ اور دنیا میں سوشلسٹ انقلاب کا باعث بن رہے ہیں۔ اس لئے دنیا کے تمام ترقی پروروں اور انقلاب پسندوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اس صورت حال کو برقرار رکھنے کے لئے اور نیز دنیا کے انقلاب عظیم کو پھیلانے کے لئے برطانوی حکومت کی مدد کریں۔ ہندوستان کے قوم پرست تو گاندھی ازم کے اثر کی وجہ سے اور کچھ برطانوی سامراج کے سابقہ اعمال کی یاد کو بار بار تازہ کرکے گمراہ ہوگئے ہیں۔ وہ جنگ کی ان دو خصوصیات کو نہیں دیکھ سکتے۔ لیکن وہ نہ دیکھیں۔ حقیقی انقلاب پسند تو دیکھ سکتے ہیں کہ انکے سامنے کوئی بات اٹل اور نہ بدلنے والی نہیں۔ ایک آدمی جو آج تک اپنے عقائد کی وجہ سے انقلاب پسند تھا رجعت پسند بھی ہوسکتا ہے۔ اور رجعت پسند بھی حالات کے تبدیل ہونے پر ترقی پرور اور انقلاب پسند بن سکتا ہے۔ تاریخ عالم میں کئی دفعہ ایسا ہوا ہے۔ اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں۔

ہندوستانی قومیت جنگ سے قبل انقلاب پسند تھی۔ کیونکہ یہ فرسودہ سرمایہ دار سماج کے محافظ برطانوی سامراج کی مخالف تھی۔ فاشزم کو اکھاڑنے کے لئے زور دے رہی تھی۔ لیکن اب یہی قوم پرستی رجعت پسندی بن گئی۔ جب اس نے بین الاقوامی بحران میں سوشلزم کا ساتھ دینے کے عوض عمل سے ایسا اقدام کیا جس سے فاشزم کو مدد پہنچی۔ کہا جاتا ہے کہ

کانگریسی لیڈر بھی تو سوشلزم کے حق میں اور فاشزم کے خلاف اعلانات کرتے رہے ہیں۔ خود گاندھی جی نے ان خطوط میں بھی فاشزم کے خلاف آواز بلند کی تھی جو انہوں نے وائسرائے کو جیل میں لکھے۔ ہمیں دیکھنا ہے کہ کیا کانگریسی لیڈروں کے اقدامات ان کے اعلانات کے مطابق ہیں۔ اعلانات کی قدر تب ہوسکتی ہے جب ان کو عمل سے بھی صحیح ثابت کیا جائے۔ یہ دیکھ کر انتہائی افسوس ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ کانگریسی لیڈروں نے زبانی سوشلزم اور جمہوریت کی حمایت کی۔ لیکن عملاً" فاشزم کی امداد کی۔ اس کے ثبوت میں بے شمار باتیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ یہ بلاوجہ نہیں کہ برلن۔ ٹوکیو۔ آزاد ہند اور سیگان کے ریڈیو گاندھی جی کی تعریفیں کرتے ہیں۔ وہ چیانگ کائی شیک اور نحاس پاشا کی تعریف کیوں نہیں کرتے؟ وہ بھی تو پس ماندہ قوموں کی تحریک کے رہنما ہیں۔

ان حالات میں صاف نظر آتا ہے کہ کانگریس نے اپنے آپ کو فی الواقع انقلاب پسندی سے ہٹا کر رجعت پسندی کے سٹیج پر لاکھڑا کردیا ہے۔ اور یہ قومی انجمن آہستہ آہستہ ہندوستان کے عوام کی ترجمانی چھوڑ کر اس طبقہ کی نمائندہ بن گئی ہے۔ جو پرانے فرسودہ نظام کو قائم رکھنا چاہتا ہے۔ اور نئے بہتر نظام یعنی سوشلزم کے آنے سے اپنا نقصان سمجھتا ہے۔ وہ کون؟ وہی سرمایہ دارانہ اور زمیندارانہ طبقہ۔ اس کو پھر دہرانا چاہتا ہوں کہ ہندوستان میں ان حالات کے پیدا ہونے کے لئے گاندھی جی کے فلسفہ حیات نے پہلے ہی فضا صاف کر رکھی تھی۔

متذکرہ صدر باتوں سے ہی یہ حیرت انگیز امر عیاں ہوجاتا ہے کہ موجودہ بین الاقوامی بحران کے آنے سے ایک طرف ہندوستانی قومیت کس طرح رجعت پسند بن گئی۔ اور دوسری طرف برطانوی قوم کیونکر انقلاب پسند بن گئی ان دونوں حقائق کا اظہار ہندوستان کے بے سمجھ قوم پرست اور رومانی انقلاب پسندوں کو تکلیف دیتا ہے۔ اور انہیں بہت کڑوا معلوم ہوتا ہے۔ ان کو یہ سن کر رنج ہوتا ہے کہ گاندھی جی رجعت پسند بن گئے۔ اور برطانوی سماج انقلاب پسند ہوگیا۔ لیکن جو سچا انقلاب پرست ہو وہ جذبات سے کام نہیں لیتا۔ وہ واقعات کو دیکھتا ہے اور واقعات جس نتیجہ پر اس کو پہنچاتے ہیں اس پر کاربند رہتا ہے۔ واقعات ہمیں بتارہے ہیں کہ یہ دونوں باتیں صحیح ہیں اس لئے ہم ان کو تسلیم کرتے ہوئے کیوں ہچکچائیں۔
بدقسمتی سے ہمارے ملک کا پریس تمام کا تمام سرمایہ داروں کے قبضہ میں ہے۔ اس لئے

وہ ہمیں جو کچھ سنانا چاہتے ہیں وہی ہم سنتے ہیں۔ اور کچھ نہیں۔ گاندھی جی کی تحریک اور اس برت کی حمایت میں جو کچھ ہوا وہ اس پریس نے شائع کیا۔ جو کچھ اس کے خلاف ہوا۔ اس کو شائع نہ کیا گیا۔ پھر بھی اگر آپ نے غور سے دیکھا ہوگا آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ اس تحریک اور برت کی حمایت چیمبر آف کامرس۔ بیوپار منڈل۔ ٹریڈ ایسوسی ایشن وغیرہ جیسے سرمایہ دارانہ اداروں نے ہی کی۔ عوام زیادہ تر غیر جانبدار رہے۔ ملک بھر کے مزدوروں اور کسانوں کی قریباً تمام انجمنوں نے یا تو خاموشی اختیار کی یا اس کی مخالفت کی۔ انڈین فیڈریشن آف لیبر نے جو ہندوستان کے مزدوروں کی نمائندہ جماعت ہے اس کی کھلے بندوں مخالفت کی۔ جب دہلی کی برلا ملز، دہلی کلاتھ ملز اور احمد آباد کے مختلف کارخانوں کے مالکوں نے دنیا کو دکھانے کے لئے کہ مزدور بھی اس تحریک کے ساتھ ہیں اپنے کارخانوں کو خود ہی بند کردیا تو مزدوروں نے احتجاج کیا۔ اور حکومت کے دروازے پر دستک دے کر ان کارخانہ جات کو کھلوادیا۔ یہ خبریں سرمایہ دارانہ قومی پریس میں شائع نہ ہوئیں۔ کیوں؟ اسی طرح جو کچھ امریکہ اور ولایت کے اخبارات نے اس تحریک کے خلاف لکھا اس کو بھی شائع نہ کیا گیا۔ مثلاً "لندن ٹائمز" نے برت کے بارے میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کا وہ ریزولیشن شائع کیا تھا جو کمیٹی ہذا نے اس وقت پاس کیا تھا جب انڈیمان میں سیاسی قیدیوں نے بھوک ہڑتال کی تھی۔ ان دنوں کانگریسی حکومتیں صوبوں میں کام کر رہی تھیں۔ اس لئے ورکنگ کمیٹی نے جیل سے آزادی حاصل کرنے کے لئے بھوک ہڑتال کرنے کے طریق کار کی پر زور مذمت کی تھی اور گاندھی جی نے بھی اس پر رائے زنی کرتے ہوئے ۱۹ اگست ۱۹۳۱ کے "ہری جن" میں لکھا تھا کہ اگر کوئی سیاسی قیدی اپنی رہائی حاصل کرنے کے لئے مرن برت رکھے تو اس کو مرنے دینا چاہیے۔ "لندن ٹائمز" نے ان دستاویزات کی نقل کرنے کے بعد لکھا تھا کہ گاندھی جی کس منہ سے اپنے لئے اب غیر مشروط رہائی کا مطالبہ کر رہے ہیں؟ غیر ممالک کے پریس کی ایسی تنقیدیں ہندوستانی سرمایہ داروں نے قومی پریس میں شائع نہ کیں۔ کیا میں دریافت کرسکتا ہوں کہ کیوں؟

ہندوستانی قوم پرست اکثر کہا کرتے ہیں کہ یہ سب صحیح ہے۔ لیکن ہندوستان جب تک برطانوی سامراج سے آزاد نہیں ہوتا تب تک ہم کس طرح برطانیہ کے ساتھ تعاون کرسکتے ہیں۔ وہ تو ہمارا ہر حالت میں دشمن ہے۔ یہ دلیل دراصل ہندوستانی عوام کے جذبات کی

ترجمانی نہیں کرتی۔ یہ ہندوستانی سرمایہ داروں کی حجت ہے۔ متذکرہ صدر باتوں کو نظرانداز کرتے ہوئے بھی دیکھنا یہ ہے کہ برطانوی سامراج کی اپنی حالت آج کیا ہے؟ چلئے یہ بھی ملاحظہ فرمایئے:۔

برطانوی سامراج ہندوستانی عوام کو گذشتہ ڈیڑھ سو سال کے اندر چوستا رہا۔ ہمیں دیکھنا چاہیے کہ اس چوسنے کے کیا کیا طریقے تھے۔ یعنی سامراج کس کو کہتے ہیں۔ جب ایک ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ ملک اپنے سرمایہ کو اپنے ملک میں نہیں کھپا سکتا۔ تو وہ اس کو دوسرے پسماندہ ملک میں لے کر وہاں کارخانہ جات قائم کرتا ہے اور وہاں کے لوگوں کو اقتصادی طور پر اپنا غلام بناتا ہے۔ بعد میں اس کو وہاں کی سیاسیات پر بھی چھا جانا پڑتا ہے تاکہ اپنے سرمایہ کو محفوظ رکھ سکے۔ یہی آج سے ڈیڑھ سو سال قبل انگریزوں نے بھی کیا۔ ہندوستان کی قومی تحریک کا مدعا تھا کہ غلام ہندوستان اور برطانوی سرمایہ داروں کے اس رشتہ کو توڑ ڈالے۔ چلئے دیکھیں اس رشتہ کی آج کیا حالت ہے؟ موجودہ جنگ کے شروع ہونے کے وقت انگریز سرمایہ داروں کا ہندوستان کے کارخانہ جات میں کل ۴۶۹ کروڑ روپیہ کا سرمایہ لگا ہوا تھا اس لئے کہا جاسکتا تھا کہ اس وقت برطانوی حکومت ہمارے لئے سامراجی حکومت ہے۔ لیکن کیا آپ کو معلوم ہے کہ ان تین سال کے اندر کیا کچھ ہوا ہے؟ انگریز سرمایہ داروں نے حالات سے مجبور ہوکر اپنا سرمایہ تو ہندوستانی سرمایہ داروں کو فروخت کردیا ہے یا امریکی سرمایہ داروں کو۔ چنانچہ ۴۲۔ ۱۹۴۱ء میں یہ سرمایہ صرف ۱۸۰ کروڑ روپیہ باقی رہا تھا۔ جنگ سے قبل ہندوستان برطانیہ کا قرضدار تھا۔ لیکن اس جنگ نے برطانیہ کو ہندوستان کا قرضدار بنادیا۔ اور آج ہندوستان کا کروڑوں روپیہ سٹرلنگ بیلنسز (Sterling Balances) کی شکل میں لندن میں پڑا ہوا ہے۔ پوچھا جاسکتا ہے کہ ایسا کس طرح اور کیوں ہوا؟ جواب صاف ہے۔ برطانوی حکومت ایک ایسے انقلاب میں پھنس گئی ہے جو اس کو سامراج سے ہاتھ دھونے پر مجبور کر رہا ہے۔ ان حالات میں برطانوی حکومت کے لئے ہندوستان کو اپنے قبضہ میں رکھنا غیر ضروری ہی نہیں بلکہ نقصان رساں ہے۔ اقتصادی طور پر دیکھا جائے تو اب ہندوستان برطانوی سامراج سے آزاد ہوچکا ہے۔ اور وہ یا تو ہندوستانی سرمایہ داروں کے قبضہ میں آگیا ہے۔ یا امریکی سامراج کے قبضہ میں ہے۔ سیاسی طور پر بھی وہ قریباً" آزاد ہے۔ کرپس کے ذریعہ جو اعلان کیا گیا تھا وہ اسی آزادی کا پروانہ تھا۔ برطانوی حکومت کے سامنے اس وقت جو

سوال درپیش ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستان کس کے حوالے کیا جائے؟

برطانوی حکومت اور برطانیہ کے لوگ خود انقلاب پسند ہوگئے ہیں اور سوشلزم کے اثر میں آگئے ہیں۔ اس لئے وہ اب نہیں چاہتے کہ ہندوستان کو ہندوستانی سرمایہ داروں کے حوالے کردیں۔ لیکن ہندوستان کی موجودہ سیاسی پارٹیاں یعنی کانگریس اور مسلم لیگ وغیرہ سرمایہ داروں کے قبضہ میں ہیں۔ ہندوستان کے شور مچانے والے سیاستدان زیادہ تر یہی سرمایہ دار ہیں۔ پریس بھی ان ہی کے قبضہ میں ہے۔ جمہور کے حقیقی نمائندے یعنی سوشلسٹ اور انقلاب پسند قلیل تعداد میں ہیں۔ اور ان کی آواز بہت دھیمی ہے۔ ان کو حکومت حوالے کی جائے تو کس طرح؟ یہی ہندوستان کی سیاسیات کا موجودہ سب سے بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے۔

گذشتہ دنوں سے امریکہ ہندوستان کی آزادی کے معاملے میں بڑی دلچسپی لے رہا ہے۔ ہندوستان کے کانگریسی سرمایہ دار امریکنوں کو التجائیں کر رہے ہیں کہ ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرادے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ یہی کہ امریکہ کے سرمایہ داروں نے انگریزوں سے ہندوستان کے کافی کارخانے خرید لئے ہیں۔ وہ اب پس پردہ ہمارے لئے سامراجی بن گئے ہیں۔ وہ ہندوستانی سرمایہ داروں کے ساتھ مل کر ہمیں جنگ کے بعد لوٹنا چاہتے ہیں اس لئے انگریزوں کو جو سوشلزم کے زیر اثر آرہے ہیں) میدان سے پہلے ہی نکال دینا چاہتے ہیں۔ قومی حکومت قائم کرانے کے درپردہ یہی راز پوشیدہ ہے۔

ان حالات میں ہندوستانی انقلاب پسند کے لئے راستہ صاف ہے۔ وہ دیکھ رہا ہے کہ ہندوستان برطانوی سامراج سے آزاد ہورہا ہے۔ اور آج کل وہ عبوری دور سے گذر رہا ہے۔ ہندوستان مستقبل میں یا تو بالکل آزاد ہوگا یا ہندوستانی سرمایہ داروں اور امریکی سامراجیوں کے قبضہ میں چلا جائے گا۔ اگر ہندوستان کو حقیقی طور پر آزاد کرنا ہے تو ہمیں ان قوموں کے ساتھ ساتھ رہنا چاہیے جو جنگ کے بعد سوشلزم کے اثر میں آئیں گی ان میں سے ایک برطانیہ ہے جس کے ساتھ ساتھ ہم آج کل ہیں۔ ہندوستانی سرمایہ دار ایسا نہیں چاہتے ان کے سامنے آزادی کا مطلب ان کی حکومت ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ انگلستان میں سوشلزم کا انقلاب آرہا ہے۔ اس لئے اگر ہندوستان اس کے ساتھ رہا تو یہاں بھی اس کے اثرات پڑ جانے یقینی ہیں۔ وہ سوشلسٹ انگلستان کی نسبت سامراجی امریکہ کو پسند کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ہندوستانی حکومت کا دروازہ ہندوستانی عوام پر کھل رہا ہے اس لئے وہ انتہائی زور لگا

رہے ہیں کہ عوام کے قومی جذبات کو مشتعل کر کے جنگ ختم ہونے سے قبل ہندوستان کو "آزاد" کرائیں۔ یعنی ہندوستان میں سماجی انقلاب آنے سے پہلے ہی اس کو اپنے گرفت میں لے لیں۔ ورنہ اگر جمہور بیدار ہوگئے تو پھر کچھ نہ بن پڑے گا۔ اپنی قوم کے نام پر اپنے ہم وطنوں کے جذبات کو مشتعل کر کے ہٹلر نے بھی جرمن سرمایہ داروں کے لئے حکومت حاصل کی تھی اور پھر جرمن عوام کو کچل ڈالا تھا۔ یہی ہندوستان کے سرمایہ دار بھی کرنا چاہتے ہیں۔ کون انقلاب پسند ہوگا جو انقلاب کے صحیح معنی سے واقف ہو اور ان کو ایسا کرنے دے؟

ہندوستان کی "قومی تحریک" آج کل ان ہی سرمایہ داروں کی تحریک ہے۔ اس کا جمہور کی تحریک کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں۔ ہندوستان کی حکومت کو سرمایہ داروں کے حوالے کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہندوستان میں رجعت پسندی کا دور دورہ ہو۔ ہندوستان میں فرسودہ نظام کو قائم رکھا جائے۔ جاگیرداری۔ زمینداری اور سرمایہ داری کو ہندوستانی عوام کے چوسنے کا موقعہ دیا جائے۔ اس قسم کی تحریک کا ساتھ کوئی حقیقی انقلاب پسند نہیں دے سکتا۔

کانگریس کی موجودہ تحریک رجعت پسندانہ ہے انقلاب پرورانہ نہیں۔ جو تحریک عوام کو ترقی کے راستے پر نہیں لے جاتی۔ جو ہمیں دنیا کے ترقی پرو عناصر کے ساتھ نہیں ملاتی۔ وہ مخالف انقلاب ہی ہوسکتی ہے انقلاب پرور نہیں۔

قومیت کی تحریکیں ہندوستان کے باہر اور ملکوں میں بھی چل رہی ہیں۔ چین میں بھی قومی تحریک ہے اور مصر میں بھی۔ جنگ سے قبل ان تحریکوں میں برطانیہ کے خلاف کافی جذبہ تھا۔ لیکن جب بین الاقوامی بحران آیا تو ان لوگوں نے بجا طور پر اپنے آپ کو دنیا کے ترقی پرور عناصر کے ساتھ ملایا۔ اور یہ جانتے ہوئے کہ برطانیہ دنیا کی عوام کے دشمن -- فاشزم -- کے خلاف کھڑا ہوا ہے۔ اس لئے ان کی امداد کا بجا طور پر حقدار ہے۔ انہوں نے اس کی مخالفت نہ کی۔ ہندوستان میں اس کے عوض گاندھی جی نے غلط رہنمائی کی دراصل ان کے رجعت پسندانہ فلسفہ حیات نے ان کے سیاسی پروگرام کے کھوکھلے پن کو ثابت کردیا۔ اور ہمیں دنیا کے حقیقی انقلاب پسندوں کی امداد سے محروم کردیا۔ میں گاندھی جی کی نیت پر ہرگز ہرگز حملہ نہیں کرتا۔ وہ بڑے ایمان دار ہیں۔ سچے ہیں۔ محب وطن ہیں۔ لیکن ان کا فلسفہ حیات اور ان کے عقائد انسانی سماج کی ترقی کے لئے نہ مناسب ہیں اور نہ موزوں۔ تو

ہم ان کے ساتھ کس طرح اتفاق کرسکتے ہیں؟ سرمایہ داروں کے فائدے کے لئے ضروری تھا کہ وہ یہ قدم اٹھائیں۔ لیکن وہ لوگ جو انقلاب ہی کو نئے سماج کے قائم کرنے میں اپنا مد و مددگار سمجھتے ہیں۔ وہ گاندھی جی کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ گاندھی جی کی تحریک کا موجودہ برا انجام ہونے کے بعد اب کانگریس کے سامنے ایک بڑا سوال آئے گا۔ وہ یہ کہ کیا اس کو عوام کی نمائندہ جماعت بننا ہے یا ہندو سرمایہ داروں کی ترجمانی کرنی ہے (کیونکہ مسلم سرمایہ دار اب مسلم لیگ کے تلے جمع ہوگئے ہیں) اگر وہ عوام کی ترجمان انجمن بننا چاہتی ہے تو کانگریس کو گاندھییت چھوڑ کر سوشلزم کے حلقہ میں جانا ہوگا۔ ورنہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہوجائیں گے۔ وہ لوگ جو سوشلزم پر ایمان رکھتے ہیں یعنی سچے انقلاب پسند ہیں۔ وہ اس سے علیحدہ ہوجائیں گے اور کانگریس خالص سرمایہ دارانہ جماعت ہوکر رہ جائے گی ہندوستان میں طبقاتی کش مکش شروع ہوگئی ہے۔ اور روزبروز یہ نمایاں ہونے لگی ہے۔ سرمایہ داروں نے گاندھی جی کے رجعت پسندانہ فلسفہ حیات کا آسرا لے کر اور کانگریس پر قبضہ کرکے جمہور کی آزادی پر دھاوا بول دیا ہے۔ پہلے حملے میں وہ ناکام رہے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ جدوجہد کو چھوڑ دیں گے۔ اور نئے حملے نہیں کریں گے۔ جیسا کہ اوپر لکھا گیا کہ بحران کے وقت ہر ایک انسان کو اپنا فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ کس طرف جائے گا۔ ہندوستان میں سرمایہ داروں۔ جاگیرداروں اور زمینداروں نے عوام کی ذہنیت پر قابو پالیا ہے۔ بدقسمتی سے گاندھی جی بھی ان ہی کی طرف ہولئے ہیں۔ لیکن اس سے سچے انقلاب پسندوں کو نہیں ڈرنا چاہیے۔ بڑی جنگ اور زبردست جدوجہد ابھی باقی ہے۔ یہ جلد ہی نمودار ہوجائے گی اور ہمیں اس میں حصہ لینا ہوگا۔ اپنے عقائد کو مدنظر رکھ کر میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں عوام کی طرف رہوں گا۔ یعنی سوشلسٹ انقلاب کی طرف۔ میں ہندوستانی سرمایہ داروں کا ساتھ نہ دوں گا۔ اس وقت سرمایہ داروں کے پروپیگنڈے سے دبے ہوئے غریب عوام کا کافی حصہ ان ہی کی طرف چلا گیا ہے۔ یہ غریب نہیں دیکھ سکتے کہ ان کے حقیقی مفاد کس طرف رہنے سے حاصل ہوسکتے ہیں؟ وقت آرہا ہے جب سرمایہ داروں کی چالاکیاں منظر عام پر آئیں گی اور ہندوستانی عوام دیکھ لیں گے کہ حقیقت کیا ہے؟

(۷ مارچ ۱۹۴۳ء)

نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ

انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد اس لئے پڑی تھی کہ ہندوستان کو برطانوی سامراج سے آزاد کردیا جائے۔ کئی وجوہات سے ہمارا ملک دنیا کی ترقی کی دوڑ میں آج سے صدیوں قبل پیچھے رہ گیا۔ اور مغربی ممالک کے دوش بدوش نہ چل سکا اور اس لئے پس ماندہ رہا۔ جب سرمایہ داری نے یورپ میں ترقی کی اور وہاں کے سرمایہ داروں کے پاس فالتو سرمایہ جمع ہوگیا تو ان کے لئے ضروری تھا کہ وہ اس کو فائدہ بخش طریقہ پر لگانے کے لئے پسماندہ ملکوں میں جائیں ان پر قبضہ کریں۔ اور وہاں اپنا یہ فالتو سرمایہ لگا کر وہاں کے باشندوں کو لوٹیں۔ پسماندہ ہندوستان اسی طرح سامراجی انگریزوں کے قبضہ میں آیا۔ لیکن قانون قدرت کی رو سے دنیا ایک حالت پر برقرار نہیں رہتی۔ انسان کی ترقی کو روکا نہیں جاسکتا۔ایک سو سال سامراج سے دبے رہنے کے بعد ہندوستانی بیدار ہوئے۔ اور انہوں نے کوشش شروع کردی کہ اس سامراج سے چھٹکارا پالیں۔ ملک میں قومی تحریک رونما ہوئی اور اس قومی تحریک نے کانگریس کو جنم دیا۔ ظاہر ہے کہ اس تحریک کو جنم دینے والے نہ ہندو تھے۔ نہ مسلمان بلکہ سامراج سے دبے ہوئے ہندوستانی عوام تھے جو کہ یکساں سامراج سے چوسے جارہے تھے۔ اس تحریک میں مذہب و ملت کی کوئی تمیز نہ تھی۔

پسماندہ ملکوں اور قوموں کے لوگوں پر مذہب کا بہت گہرا اثر ہوتا ہے۔ مذہب زدگی کا دوسرا نام ہی پسماندگی ہے۔ قدرتاً" ہندوستانی عوام پر بھی مذہب کا اثر ہے۔ اور انگریزی سامراجیوں نے قومی تحریک کی ابتداء سے ہی انتہائی کوشش کی کہ ہندوستانیوں کو مذہب کی بناء پر بانٹ دیا جائے۔ لیکن کانگریس کے ابتدائی لیڈر گو انقلاب پسند نہ تھے بلکہ اعتدال پسند تھے۔ لیکن مکمل طور پر غیر فرقہ وارانہ ذہنیت کے لوگ تھے۔ وہ خالص سیاسی لیڈر تھے۔ اس لئے سامراجیوں کی زیادہ نہ چل سکی۔ اور وہ اپنے ناپاک مشن میں ناکام ہی ہوتے رہے۔ یہ حالت ۱۹۲۰ء تک جاری رہی۔ اور اس دور میں قومی تحریک ترقی کرتی گئی۔ اس کے بعد

ہندوستانی پالیٹکس میں مہاتما گاندھی کا ظہور ہوا۔ گاندھی جی خالص سیاسی لیڈر نہیں۔ انہوں نے سیاسیات کو مذہب کے ساتھ خلط ملط کردیا۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ وہ سیاسی لیڈر سے زیادہ مذہبی لیڈر ہیں تو مبالغہ نہیں ہوگا۔ وہ سیاسیات کو ہیچ سمجھتے ہیں۔ اور مذہب کو ہی سب کچھ مانتے ہیں۔ قدرتی طور پر بہت وسیع القلب اور کشادہ دل ہونے پر بھی ان کے ایمان میں ہندو کلچر کی جھلک اور ہندو پن کا ہونا لازمی ہے۔ اس لئے جب وہ ہندوسانی سیاسیات کے بلند ترین رہنما ہوگئے ہماری قومی تحریک سیاسی نوعیت کی رہنے کے بدلے مذہبی شکل میں تبدیل ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی پسماندہ ہندوستانیوں کی مذہبی حس بھڑک اٹھی۔اور ایسا ہونے پر ہندوستانی سیاسیات میں دو باتیں ہوئیں جو قابل ذکر ہیں۔

اول یہ کہ ہندوستانیوں کی غالب اکثریت ہندوؤں کی ہے۔ عام ہندوؤں نے جو پس ماندہ ہونے کی وجہ سے مذہب زدہ ہیں اس تحریک میں اپنی پسماندگی کے رجعت پسندانہ جذبات کا اظہار دیکھا۔ اس لئے ان کو اس سے محبت ہوئی۔ اور اس تحریک میں اجتماعی زندگی پیدا ہوگئی۔ یہ اجتماعی زندگی تحریک کی کامیابی کے لئے ابتداء میں قدرے فائدہ مند ثابت ہوئی۔ لیکن اس سے بعد میں مہلک اور خطرناک نتائج پیدا ہوئے۔ جن کو ہم آج کل بھگت رہے ہیں۔

مہاتما گاندھی کے سر یہ طرہ امتیاز ہے کہ انہوں نے ہندوستانی جمہور کو بیدار کردیا۔ ان سے قبل کسی نے ایسا نہ کیا تھا۔ دیکھنا یہ ہے کہ انہوں نے جمہور کو کس طرح بیدار کیا۔ اگر انہوں نے ہندوستانی عوام کو اقتصادی اور سیاسی مسائل سمجھا کر بیدار کردیا ہوتا اگر انہوں نے ہندوستانی سماج کو اپنی بے بسی اور سامراج کے ظلم کو واضح کرنے کے بعد بیدار کیا ہوتا تو گاندھی جی اس فخر کے صحیح معنوں میں حق دار تھے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ انہوں نے ہندوستانی عوام کے مذہبی جذبات کو ابھار کر بیدار کیا۔ انہوں نے ہندوؤں کو رام راجیہ کے وعدے دے کر بیدار کیا۔ گو اس قسم کی بیداری انگریزی سامراجیوں کو ابتداء میں پریشان کرنے کے لئے کسی حد تک کامیاب بھی ہوئی۔ لیکن جیساکہ ہونا چاہیے تھا۔ اب یہ بیداری ہندوستان کی آزادی کی راہ میں سنگ گراں ثابت ہورہی ہے۔ اور اس نے ایسے ایسے فرقہ وارانہ مسائل پیدا کردئے ہیں کہ ڈر لگتا ہے کہ ان کی وجہ سے صدیوں تک ہندوستان آزاد نہ ہوگا۔ اور جس سماجی اور سیاسی انقلاب کی ہمیں ضرورت ہے وہ کبھی پورا ہوکر نہ رہے گا۔

اس لئے یہ بہتر ہوتا کہ ہندوستانی عوام بیدار ہی نہ ہوتے۔ یہ بیداری کس کام کی جس نے ہندوستانیوں کے پست جذبات کو بری طرح ابھارا۔ آج ہندوستان کے لوگ اور خاص کر ہندو کانگریس تحریک کو اپنی سیاسی آزادی کا ہتھیار نہیں سمجھتے۔ بلکہ رام راجیہ کو واپس لانے۔ گئے گذرے ہندو کلچر کو از سرنو زندہ کرنے۔ اور "رگھوپتی راگھو راجا رام" کے گیت گانے کی مذہبی تحریک سمجھتے ہیں۔ کانگریسی جلسوں کی اہمیت اتنی ہی رہ گئی ہے جتنی کمبھ کے میلہ کی۔ ہندو مسٹر موہن داس کرم چند گاندھی کو اپنا سیاسی لیڈر نہیں سمجھتے بلکہ ایک مذہبی بزرگ۔ مہاتما۔ رشی۔ سادھو اور اوتار مانتے ہیں۔ اور پھر بھی دعوی یہ ہے کہ کانگریس کی تحریک ہندوستان کی سیاسی آزادی کی تحریک ہے۔ کتنا اچنبھا ہے؟

ادھر گاندھی جی نے قومی تحریک پر مذہب کا رنگ چڑھادیا۔ ادھر سے پس پردہ اقتصادیات میں بھی ایک عظیم تغیر آیا۔ اب اس کی طرف دھیان دیجئے انگریزوں نے ہندوستان کی مرکزی حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی۔ اس لئے ابتداء میں مسلمان ہی انگریزوں کے زیادہ دشمن تھے۔ انہوں نے ہی ہندوستان کے اکثر حصوں میں ان کے خلاف بغاوتیں اور سازشیں کیں۔ اس لئے سامراجی انگریزوں نے ہندوؤں کی حوصلہ افزائی کی اور ان کو اپنی طرف لانے کی کوشش کی۔ صدیوں کی غلامی کی وجہ سے ہندوؤں کی ذہنیت ویسے ہی پامال ہوچکی تھی۔۔ اس لئے وہ اپنے وطن کے دشمنوں کی اس حوصلہ افزائی سے خوش ہوئے۔ حاکموں کی حوصلہ افزائی سے قدرتی طور پر ہندوؤں نے ترقی کی۔ ہندو سرمایہ دار ملک پر آہستہ آہستہ چھاگئے۔ انہوں نے نہ صرف ان صوبوں کی تجارت ہی اپنی گرفت میں لی۔ جہاں ہندو اکثریت میں تھے بلکہ جہاں مسلمانوں کی اکثریت بھی تھی۔ گویا کہ تمام ملک میں ہندو سرمایہ دار ہی برسر اقتدار ہوگئے۔ مسلمان سرمایہ داروں کی تعداد گھٹ گئی۔ جو کچھ باقی رہے دبے رہے۔

وقت گزرنے پر ہندوستانی سرمایہ داری نے ترقی کی۔ ہندو سرمایہ داروں کو برطانوی سامراج اپنا دشمن دکھائی دیا۔ اور ان کو صاف نظر آیا کہ جب تک یہ ملک میں موجود ہے وہ مزید ترقی نہیں کرسکتے۔ اس لئے یہ لوگ ہر طرح سے آزادی کی تحریک کی امداد کرنے لگے۔ اور ان کا کانگریس پر کافی اثر ہونے لگا۔ یہ برا نہ تھا کیونکہ پسماندہ ملکوں میں سامراج کے نکالنے کے لئے ملکی سرمایہ دار کافی امداد دے سکتے ہیں۔ وہی لوگ قومی تحریک کے ابتداء میں

رہنما بن جاتے ہیں۔ اگر قومی تحریک خالص ترقی پرور سیاسی اصولوں پر چلتی رہے۔ تو ایک وقت پر جمہور ملکی سرمایہ داروں کے ساتھ مل کر سامراج کو نکال دیتے ہیں اور پھر خود ان سرمایہ داروں کا مقابلہ کر کے ان کو بھی شکست دے کر وطن کو مکمل طور پر آزاد کردیتے ہیں۔ یہی ہندوستان میں بھی ہوتا۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہوا۔ ۱۹۱۷ء میں جنگ یورپ کے بعد روس میں جو سوشلسٹ انقلاب برپا ہوا اس نے دنیا کے دوسرے سرمایہ داروں کی طرح ہندوستانی سرمایہ داروں کو بھی پریشان کردیا۔ اور انہوں نے سوچا۔ اگر ہندوستان کی قومی تحریک خالص سیاسی اور اقتصادی اصولوں پر چلتی رہے تو یہ اگرچہ انگریزی سامراج کو ملک سے نکال دے گی۔ لیکن اس کے بعد ان کا بھی خاتمہ کرسکتی ہے۔ اور جمہور کو برسراقتدار لاسکتی ہے۔ اس لئے اس کے سدباب کا انتظام کرنا چاہیے۔ جب ۱۹۲۰ء میں ہندوستانی پالیٹکس میں مہاتما گاندھی کا ظہور ہوا۔ تو ہندستانی سرمایہ داروں کی یہ خواہش پوری ہوگئی۔ کیونکہ گاندھیت کے زیر اثر ہمارا قومی پالیٹکس خالص سیاسی رہنے کے بدلے مذہبی بن گیا۔ اور مذہب کا آسرا لے کر ہندوستانی سرمایہ داروں نے جمہور کو گمراہ کردیا۔ اور اپنے قابو میں رکھا۔

۱۹۲۰ء سے لے کر جب سے کانگریس گاندھیت کے اثر میں آئی۔ ہماری قومی تحریک آہستہ آہستہ اپنے نصب العین اور صحیح راستے سے بھٹک کر رجعت پسندی کی طرف چلی گئی۔ اس پر ہندو سرمایہ داروں کا غلبہ ہوگیا اور وہی لوگ ہیں جو اس تحریک کو آسمان پر چڑھا رہے ہیں۔ اور بتا رہے ہیں کہ یہی انقلابی تحریک ہے۔ ہمارا قومی پریس انہی سرمایہ داروں کی ملکیت ہے اس لئے جب قومی پلیٹ فارم اور قومی پریس سے انہیں سرمایہ داروں کے خیالات اور آوازیں متواتر آتی رہتی ہیں۔ اور اس کے جواب میں جمہور اور عوام کی طرف سے دھیمی آواز بھی بلند نہیں ہوتی۔ تو ان سرمایہ داروں کا نظریہ ہی قومی نظریہ اور عوام کا نظریہ مانا جاتا ہے۔ کسی کو ہمت نہیں ہوتی کہ اس کے خلاف اپنی رائے کا اظہار کرے۔ غیر سرمایہ داروں کی اکثریت نہ جانتے ہوئے بھی اپنے ان چوسنے والوں کی رائے کو ہی اپنی قومی رائے سمجھتے ہیں۔

۱۹۲۱ء سے ہندوستانی پالیٹکس میں گاندھی یگ یا گاندھی کا زمانہ شروع ہوا۔ اس زمانہ کی ابتداء میں ہندو سرمایہ دار اپنے ناپاک منصوبوں میں مکمل طور پر کامیاب ہوئے۔ لیکن یہ حالت دیر تک قائم نہ رہی۔ کانگریس کے ذریعہ اور پریس سے پروپیگنڈا کرکے انہوں نے

ہندو جمہور کو اپنے قبضہ میں کیا۔ ان کو مذہب کی افیون اور رام راجیہ کا چکمہ دے کر سیاسی طور پر سلادیا۔ اور اس بات پر بھی تیار کردیا کہ وہ خود ہی "قومی حکومت" اور "قومی آزادی" کے نام پر اپنی غلامی کی زنجیریں تیار کریں۔ لیکن ہندو سرمایہ داروں نے اپنے اس طریق کار سے ہی اپنے لئے ایک نئی آفت کو بھی پیدا کردیا۔ وہ کیا؟ مسلم سرمایہ دار۔ اوپر لکھا گیا ہے کہ تاریخی واقعات کی وجہ سے ہندوستان کی اقتصادی زندگی پر ہندو سرمایہ دار کا قبضہ ہے۔ وہ اپنی اس گرفت کو ڈھیلا نہیں کرنا چاہتا۔ اس کی راہ میں اگر کوئی رکاوٹ تھی۔۔ تو وہ انگریزی سامراج تھا اس کو نکالنے کے لئے اس نے ہندو جمہور کی امداد حاصل کی۔ ہندو عوام کو گاندھی ازم کے فلسفہ حیات نے اس حد تک بے حس کردیا کہ وہ سماجی انقلاب کے قابل ہی نہ رہے۔ بلکہ سرمایہ داروں کی "قومی حکومت" قائم کرنے کے لئے ان کی آواز کو ایک طوطے کی طرح دہراتے رہتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ہندو سرمایہ دار گاندھیت کے فلسفہ حیات سے مسلم جمہور کو آسانی سے گمراہ نہ کرسکتے تھے۔ اور مسلم سرمایہ دار اتنے بیوقوف نہ تھے کہ ہندو سرمایہ داروں کی چالاکیوں کو نہ سمجھتے نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم سرمایہ داروں نے بھی اپنے مفاد حاصل کرنے کے لئے حرکت کرنی شروع کی۔ ادھر سے انگریز سامراجیوں نے بھی اپنی پالیسی بالکل بدل ڈالی۔ اب انہیں ہندو سرمایہ داروں کی طرف سے خوف پیدا ہوا۔ کیونکہ وہی لوگ برطانوی سامراج کے شدید مخالف تھے اور اس کو ہندوستان سے نکالنا چاہتے تھے۔ اس لئے انگریزوں نے مسلم سرمایہ داروں کی امداد کرنی شروع کی۔

گذشتہ بیس سال کے اندر ہندو سرمایہ داروں نے بہتیری کوشش کی کہ مسلم سرمایہ داروں کو نیست و نابود کریں۔ ان کی آواز کو دبائیں۔ ان کی اہمیت کو کم کریں۔ ہندو سرمایہ داروں کے پاس پروپیگنڈا کے موثر لور وسیع ذرائع موجود ہیں۔ وہ ابتداء میں بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ انہوں نے اپنی تحریک کو قوم پرستی کا پاک و پوتر نام دیا اور مسلم سرمایہ داروں کی تحریک کو فرقہ پرستی کے بظاہر ذلیل نام سے بدنام کیا۔ تمام ہندوؤں کے دلوں پر بلکہ مسلمانوں کے ایک طبقہ کے دل پر بھی بٹھادیا کہ ان کی تحریک انقلاب پسندانہ اور ترقی پرورانہ ہے اور مسلم سرمایہ داروں کی تحریک رجعت پسندانہ اور فرقہ وارانہ ہے۔ لیکن مسلم سرمایہ داروں کی تحریک نہ دبنی تھی نہ دبی اور جوں جوں وقت گذرتا گیا توں توں مسلم سرمایہ دار بھی منظم ہونے لگے۔ کیونکہ ان کو صاف دکھائی دیا کہ اگر ہندوستان کی آزادی کا مطلب

یہ ہوگا کہ یہاں ہندو سرمایہ داروں کا راجیہ قائم ہو تو مسلم سرمایہ داروں کی خیر نہیں ان کا خاتمہ یقینی ہے۔ ہندوستان کی گذشتہ بیس سال کی تاریخ ہندوستانی سرمایہ داروں کے اس تضاد اور اندرونی پھوٹ کی تاریخ ہے جس کا نام فرقہ وارانہ جدوجہد رکھا گیا ہے۔ اور جس میں غریب عوام کو فوج کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔ جس میں ہندو اور مسلم سرمایہ دار اپنے مفاد کی خاطر معصوم عوام کو مذہب کی افیون کھلا کر ایک دوسرے کو کٹواتے رہتے ہیں۔

۱۹۲۲ء کی عدم تعاون کی تحریک میں مسلمان کافی تعداد میں کانگریس کے اندر موجود تھے۔ وہ بھی ہزاروں کی تعداد میں جیل گئے۔ ۱۹۳۰ء کی تحریک میں ان کی تعداد کم ہوگئی۔ اس وقت احرار بھی تحریک میں شامل نہ ہوئے۔ اس کے بعد مسلمان کانگریس سے آہستہ آہستہ علیحدہ ہوگئے۔ ۱۹۳۵ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ نافذ ہوا۔ جس کی رو سے ہندوستانی صوبوں کو بہت کچھ خود مختاری حاصل ہوئی۔ اس وقت مسلم سرمایہ داروں کو پورا احساس ہوا کہ اب ہندوستان آزاد ہوا چاہتا ہے۔ اس لئے ان کو ہندو سرمایہ داروں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے تو جس طرح ہندو سرمایہ داروں نے اپنے مفاد کو حاصل کرنے کے مقصد کی تکمیل کے لئے مہاتما گاندھی کو جنم دیا۔ اسی طرح مسلم سرمایہ داروں نے مسٹر محمد علی جناح کو پیدا کردیا۔۔ مسٹر محمد علی جناح نے بھی عوامی تحریک کا رہنما بننے میں مہاتما گاندھی کی طرح حیرت انگیز ترقی کی۔ وہ دیکھتے دیکھتے قائد اعظم بن گئے۔ اور آج ہندو سرمایہ داروں کے اس پروپیگنڈا کے باوجود کہ مسٹر جناح کو کوئی نہیں پوچھتا وہ مسلم قوم کے دلوں کے مالک ہیں۔ ان کی آنکھوں کے نور ہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ مسٹر جناح مسلم عوام کی خواہشات اور جذبات کے صحیح ترجمان ہیں۔ ہرگز نہیں۔ مسلم عوام کو ہندو عوام کی طرح ایک سیاسی اور سماجی انقلاب ہی آزاد کرسکتا ہے۔ اور موجودہ مصائب سے آزادی دلاسکتا ہے۔ مسٹر جناح انقلاب پسند نہیں بلکہ مہاتما گاندھی کی طرح پسماندہ قوم کے رجعت پسندانہ جذبات کا مجسم ظہور ہیں۔ مسٹر جناح بھی مسلم جمہور کو مذہب کا نشہ پلا کر گمراہ کر رہے ہیں۔اور ان سے ان ہی کی دائمی غلامی کی زنجیریں تیار کروا رہے ہیں۔۔ ان کا شاہکار یہ ہے کہ مسلم سرمایہ دار کو منظم کرکے ان کو اس بات کے لئے تیار کریں کہ ہندو سرمایہ دار سے اپنا حق چھین لیں۔ مسٹر جناح یہ کام بوجہ احسن انجام دے رہے ہیں۔ پاکستان کی سکیم کا بنیادی اصول یہی ہے۔۔ "اکھنڈ

بھارت" کے نعرہ سے ہندو سرمایہ پرست چاہتا ہے کہ تمام ہندوستان پر اپنی وہ گرفت مضبوط اور قائم رکھے جو اس وقت ہے اور پاکستان کا نعرہ بلند کر کے مسلم سرمایہ دار چاہتا ہے کہ وہ مسلم صوبوں کو ہندو سرمایہ دار کے چنگل سے نکال کر اپنے اثر میں لاسکے۔ اس میں ہندوستان کی قومیت کا کوئی راز پوشیدہ نہیں۔ دونوں سرمایہ دار غریب عوام کو چوسنا چاہتے ہیں۔ اور دونوں ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزمائی کرنے کے لئے اپنے اپنے ہم مذہب عوام کو استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ ہندوستان اکھنڈ ہو یا بٹ جائے۔۔ موجودہ صورت میں اور موجودہ سماجی حالت کے ہوتے ہوئے نہ ہندو عوام کی ملکیت ہے نہ مسلم عوام کی۔

ہندوستان کی موجود سیاسیات ہندو اور مسلم سرمایہ داروں کی باہمی جنگ ہے۔ دونوں جانتے ہیں کہ موجودہ جنگ اور بین الاقوامی حالات کی وجہ سے ہندوستان آزاد ہورہا ہے۔ اس کی آزادی کو کوئی طاقت دبا نہیں سکتی۔ انگریزی سامراج ختم ہورہا ہے۔ انگریزی حاکم جلد ہی اپنے وطن کو واپس جارہے ہیں۔ اس لئے ہندوستان پر قبضہ کرنے کا سوال اہم ترین بن گیا ہے۔۔ ہندو سرمایہ دار اپنی طاقت اور وسیع ذرائع کو جان کر چاہتا ہے کہ بلا شرکت غیرے ملک پر قبضہ کرے۔ لیکن مسلم سرمایہ دار اس کو ایسا نہیں کرنے دیتا۔ یہی اکھنڈ ہندوستان اور پاکستان کی جنگ ہے۔ عوام کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ۔ حالانکہ اپنی لاعلمی اور پس ماندگی کی وجہ سے عوام کی اکثریت بھی اس میں حصہ لے رہی ہیں۔ اور وہ لوگ جو مشین کے طور پر جمہور اور سوشلزم کے الفاظ کو استعمال کرتے ہیں وہ بھی سرمایہ داروں کی اس جنگ میں خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔

ہندو سرمایہ دار اور مسلم سرمایہ دار ہندوستانی عوام کی پسماندگی اور خفتہ حالت سے بخوبی واقف ہیں اس لئے وہ غریب عوام کے مفاد کو آسانی کے ساتھ نظرانداز کرتے ہیں۔ اور ان کی حقیقی ترجمانی کرنے والے لیڈروں اور سچے انقلاب پسندوں کو خیال میں بھی نہیں لاتے۔ جب تک ہندوستان کے مزدور اور کسان منظم نہ ہوں ان کا ایسا کرنا قدرتی ہے۔ لیکن ہمیں اصلی حالات کو جاننا چاہیے ہندو نوجوان ہندو سرمایہ داروں کے پروپیگنڈا سے گمراہ ہوکر سمجھتے ہیں کہ کانگریس صحیح راستے پر ہے۔ اور مسلم لیگ غلط راستے پر۔ ان کے دلوں پر بٹھا دیا گیا ہے کہ ہندو جنم سے ہی بڑے کشادہ دل اور قوم پرست واقع ہوئے ہیں۔ اور مسلمان غدار ہیں۔ اسی طرح مسلم نوجوانوں کے دلوں پر بھی یہ بات نقش کردی گئی ہے کہ گاندھی جی

مسلمانوں کو تباہ و برباد کر دینا چاہتے ہیں۔ ہندو ناقابل اعتبار ہیں۔ یہ سب بہتان ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ نہ تو کانگریس اور نہ لیگ عوام کی نمائندہ جماعتیں ہیں۔ اول الذکر ہندو سرمایہ داروں کی ہے اور موخر الذکر مسلم سرمایہ داروں کی۔ ہاں کانگریس جیسا کہ اوپر بتایا گیا' تمام قوم کی نمائندگی کے لئے پیدا ہوئی تھی۔ اس کا جنم اس لئے ہوا تھا کہ ہندوستان کو حقیقی آزادی دلائے۔ یعنی عوام کو سیاسی اور سماجی بندھنوں سے آزاد کردے۔ لیکن گاندھیئت کے زیر اثر اس کا وہ تاریخی مشن ختم ہوگیا اور اب آئینی طور پر غیر فرقہ وارانہ انجمن کہلا کر بھی ہندو سرمایہ داروں کی نمائندہ جماعت بن گئی ہے۔ یہ ہندوستان کو برطانوی سامراج سے آزاد کرانا چاہتی ہے۔ کس لئے؟ ہندو سرمایہ دار کی حکومت کے لئے! اس سے زیادہ نہیں۔ مسلم لیگ تو اعلانیہ ہی مسلم فرقہ کے لئے ہے۔ اور مسلم فرقہ کا مطلب مسلم سرمایہ داروں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ مسلم جمہور کے لئے تصویر کے اس خاکے میں کوئی جگہ ہی نہیں۔

ہندوستانی عوام کے سیاسی اور سماجی انقلاب کی نمائندہ نہ رہنے کی وجہ سے کانگریس کو قومی جماعت کہنا غلط ہے۔ یہ سرمایہ داروں کی جماعت ہے۔ اور گاندھی جی نے اگست ۱۹۴۲ء کی خلاف انقلاب تحریک چلا کر اس کی اس نوعیت پر مہر تصدیق ثبت کردی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ سرمایہ داروں کی نمائندہ جماعت کی حیثیت سے بھی اس کا کیا حال ہو رہا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ مسلم سرمایہ دار علیحدہ طور پر مسلم لیگ کے تحت منظم ہوگئے ہیں۔ اس لئے ہندو سرمایہ دار اب اس قدر دعوی بھی نہیں کرسکتے کہ کانگریس تمام ہندوستانی سرمایہ داروں کی نمائندہ جماعت ہے۔ قومی جماعت ہونے کی بات تو جانے دیجئے۔ ہندو سرمایہ دار اتنے خود غرض اور لالچی ہیں کہ وہ ہندوستانی عوام کو چوسنے کے ناپاک کام میں مسلم سرمایہ داروں کو بھی حصہ دار نہیں بنانا چاہتے۔ مسٹر جناح ان سے اتنا ہی مطالبہ کرتے ہیں کہ جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ وہاں مسلم سرمایہ داروں کو عوام کے چوسنے کا موقعہ دیجئے۔ وہ گاندھی جی سے للکار للکار کر کہتے ہیں۔ "جب آپ مذہب کے نام پر ہندو عوام کو ہندو سرمایہ دار بھیڑیے کے سامنے پھینک رہے ہیں۔ تو مجھے بھی اسلام کے نام پر مسلم جمہور کو مسلم سرمایہ دار چیتے کے سامنے پھینکنے دیجئے۔" لیکن ہندو سرمایہ دار اپنے وسیع ذرائع اور پروپیگنڈا کے بل بوتے پر ایسا کرنے کے لئے تیار نہیں۔ وہ اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کرنا چاہتا۔

حالات بتا رہے ہیں کہ ہندو سرمایہ داروں کے گھر میں پھوٹ پڑ گئی ہے۔ اور انہیں

گذشتہ چھ ماہ کے اندر جو ناکامیاں دیکھنی پڑیں ان سے وہ تجربہ کار بن رہے ہیں۔ ان کا ایک حصہ اب محسوس کر رہا ہے کہ اگر وہ ہندوستان پر اپنی گرفت رکھنا چاہتے ہیں تو ان کو مسلم سرمایہ دار کے ساتھ سمجھوتہ کرنا چاہیے اور اس کو اپنا حصہ دینا ضروری ہے۔ ان ہندو سرمایہ داروں کی نمائندگی شری یت راج گوپال آچاریہ کر رہے ہیں۔ وہ اسی لئے مسٹر جناح کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کے حق میں ہیں۔ وہ ہندو سرمایہ داروں کو کہہ رہے ہیں کہ اندھے نہ بنو۔ اگر ہندوستان کی حکومت چاہتے ہو۔ اگر ہندوستانی جمہور کے آنے والے سماجی اور سیاسی انقلاب سے بچنا چاہتے ہو تو ابھی اور جلدی مسلم سرمایہ دار کے ساتھ سمجھوتہ کرو۔ اس کو پاکستان دو۔ اکھنڈ ہندوستان کی رٹ نہ لگاؤ۔ ورنہ تم بھی اور مسلم سرمایہ دار بھی دونوں تباہ ہوجاؤ گے۔ حال ہی میں مسٹر راج گوپال آچاریہ نے بار بار کہا کہ ہندوستان تو آزاد ہوگا۔ لیکن اگر جنگ کے ختم ہونے سے قبل قومی حکومت نہ بنی تو بڑا برا حال ہوگا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر جنگ سے قبل ہندوستان کی حکومت انگریزی سامراجیوں کے ہاتھ سے نکل کر ہندوستانی سرمایہ داروں کے حوالے نہ ہوئی۔ تو ان سرمایہ داروں کا برا حال ہوگا۔ کیونکہ جنگ کے بعد دنیا پر سوشلزم کا اثر پڑے گا۔ ہندوستان میں بھی سماجی اور سیاسی انقلاب آئے گا۔ جس میں سرمایہ داروں کو جڑ سے اکھاڑ دیا جائے گا۔ اس لئے سرمایہ داروں کو آپس میں سمجھوتہ کرکے آج ہی ہندوستان کی حکومت حاصل کرنی ہوگی۔ تاکہ ملک سوشلزم سے بچا رہے۔ یہ ہے گاندھی جی کا فلسفہ حیات اور سیاسی پروگرام۔ جو ان کے بڑے فہمیدہ چیلے مسٹر راج گوپال آچاریہ عمل میں لانا چاہتے ہیں۔

ان حالات میں ہندوستان کے حقیقی محبان وطن قوم پرستوں اور انقلاب پسندوں کو رومانی اور بے عمل نہیں بننا چاہیے۔ انہیں حالات کو بخوبی سمجھنا چاہیے۔ ہم ہندوستان کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن ہمارے سامنے آج تک آزادی کا تصور ایک مبہم چیز رہی ہے۔ اور اب اس سے سرمایہ دار فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ہم اس آزادی کو کبھی نہیں چاہتے جس میں ہندوستانی عوام انگریزوں کی گرفت سے نکل کر ہندوستانی سرمایہ داروں کے چنگل میں پھنسیں۔ یہ سمجھنا کہ سودیشی سرمایہ دار بدیشی سامراجی کی نسبت اچھے اور ہمدرد ہوتے ہیں جیسا کہ کئی نام نہاد سوشلسٹ بھی سمجھتے ہیں بالکل غلط ہے۔ اس کا تجربہ اب یورپ کے کئی ملکوں میں ہوچکا ہے۔ جہاں سودیشی سرمایہ داروں نے فاشسٹوں کا روپ دھارن کرکے یا لباس

پہن کر بربریت اور وحشیانہ طرز کی حکومت قائم کی ۔ اگر ہندوستان کی قومی حکومت ہندوستانی سرمایہ داروں کے ہاتھ میں آئے گی تو یہاں بھی فاشزم کا راج ہوگا۔ ہندوستانی انقلاب پسندوں کو نہ تو نیشنل کانگریس کے موجودہ پروگرام سے ہمدردی ہوسکتی ہے نہ مسلم لیگ سے ۔ ان کے سامنے دونوں ایک جیسے ہیں۔ کیونکہ دونوں کا سیاسی اور سماجی نظریہ ایک ہے بحیثیت قومی بزرگ کے ہمارے سامنے مہاتما گاندھی بھی قابل تعظیم ہیں اور قائد اعظم جناح بھی ۔ لیکن اس سے زیادہ نہیں۔

اس وقت نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان باہمی جنگ ہے۔ یہ جنگ تب تک جاری رہے گی جب تک جمہور سیاسی طور پر بیدار او رمنظم نہیں ہوتے۔ عوام بیدار ہوں گے تو سرمایہ داروں کو اپنی جان کے لالے پڑ جائیں گے۔ یہ ممکن ہے کہ اس وقت یہ دونوں یعنی ہندو اور مسلم سرمایہ دار اکٹھے مل کر جمہور پر حملہ کردیں۔ انقلاب پسندوں کا کام ہے کہ اس وقت تک ان دونوں کی نسبت غیر جانبدار رہیں۔ اس درمیانی وقفہ کے اندر جمہور کو بیدار اور منظم کریں۔ اور ایک جھنڈے تلے لائیں۔ ان کو سرمایہ داروں کے جو مذہبی افیون دے رکھی ہے اس کے نشے کو ہرن کردیں۔ اور جمہور کو حقیقی آزادی کی جدوجہد کے لئے تیار کریں ورنہ ان سرمایہ داروں کی آواز کے ساتھ اپنی آواز کو ملانا خطرناک اور صحیح مفاد کے خلاف ہے۔ اور اپنی دائمی غلامی کی زنجیریں خود تیار کرنا ہے۔

(۲۱ مارچ ۱۹۴۳ء)

انقلاب کا مفہوم

ہندوستان کی ایک بدقسمتی یہ بھی ہے کہ یہاں کے لوگ انقلاب کے مفہوم کو نہ سمجھنے پر بھی "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ اکثر بلند کرتے رہے ہیں۔ ہندوستان کی اقتصادی حالت اس حد تک ضرور خراب ہو چکی ہے کہ یہاں انقلاب کے بغیر عوام کی ترقی ممکن نہیں۔ لیکن جب تک عوام اس بات کو نہیں سمجھتے کہ انقلاب کس کو کہتے ہیں تب تک صرف "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ بلند کرنے سے انقلاب بپا نہیں ہو سکتا۔ اگر ہندوستان کی تحریک آزادی کامیاب نہیں ہوتی تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ یہاں عوام تو رہے الگ، اکثر سیاسی کارکن بھی انقلاب کے مفہوم سے بے خبر ہیں۔

ہندوستانیوں کے دماغ میں یہ بات نقش کر دی گئی ہے کہ انقلاب کا مطلب لوٹ مار، غارتگری قتل و خون، آتش زنی اور اسی قسم کی دوسری بھیانک باتیں ہیں۔ اور جب تک یہ باتیں کسی تحریک میں موجود نہ ہوں وہ انقلابی تحریک نہیں۔ اس کے علاوہ انہیں یہ بھی سکھا دیا گیا ہے کہ انقلابی تحریک ہمیشہ حکومت وقت کے خلاف ہوتی ہے۔ اگر کوئی سیاسی کارکن حکومت کے خلاف اشتعال انگیز تقریر کر کے مروجہ قوانین کو توڑنے کی تلقین کرے تو اس کو انقلابی لیڈر سمجھا جاتا ہے۔ اس سے زیادہ ہندوستانی عوام بلکہ بڑے بڑے لیڈر بھی انقلاب کی نسبت کچھ نہیں جانتے۔ چونکہ حقیقتاً انقلاب کا یہ مفہوم نہیں اس لئے ہندوستان اس قسم کے پرچار سے اس انقلاب سے محروم رہ گیا ہے جس کی ہمارے "قوم پرست" اور "انقلاب پرور" دوست قدم قدم پر دہائی دیتے رہتے ہیں۔ اور جس کے لمبے چوڑے دعوے وہ سٹیجوں پر چڑھ کر کیا کرتے ہیں۔ "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ بلند کرنے پر بھی یہ لیڈر اس انقلاب کو خود ہی دباتے جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ خود بھی نہیں جانتے کہ انقلاب کیا ہے۔ ان کے دماغ میں اس کے متعلق بڑی الجھنیں ہیں۔

کشمیر نیشنل کانفرنس کے ایک مقتدر لیڈر مرزا محمد افضل بیگ نے اننت ناگ میں جو تازہ

تقریر کی وہ اس دماغی الجھن کی مثال ہے۔ مرزا صاحب نے انقلاب کی نسبت اپنی اس تقریر میں چند دلچسپ باتیں بتائیں۔ انہوں نے فرمایا کہ نیشنل کانفرنس کو جنگ کے دوران میں فرقہ وارانہ جھگڑوں کا سخت اندیشہ ہے اور کانفرنسی لیڈر اس نازک مرحلے پر والئے ملک کو پریشان نہیں کرنا چاہتے۔ اس لئے نیشنل کانفرنس نے انقلابی پروگرام کو پس پشت ڈالنے اور حکومت کے ساتھ تعاون کرنے کا طرز عمل اختیار کیا ہے۔ اور ایسا کرنے سے عظیم قربانی دی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر مرزا صاحب کی سمجھ میں انقلاب کا مفہوم وہی نہ ہوتا جو تمام ہندوستانیوں کے دماغ میں بٹھا دیا گیا ہے تو وہ اس قسم کی باتیں نہ کرتے۔ اگر مرزا صاحب کو معلوم ہوتا کہ انقلاب کا حقیقی مفہوم کیا ہے اور انقلاب کے بغیر کبھی ہندوستان ترقی نہیں کرسکتا تو وہ نہ تو انقلاب پرور کی حیثیت سے اس دیدہ دلیری کے ساتھ اس بات کا اعتراف کرتے کہ کانفرنس نے انقلابی پروگرام کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ نہ یہ کہتے کہ فرقہ وارانہ جھگڑوں کے اندیشہ سے انہوں نے اس انقلاب کو تلانجلی دی ہے۔ کیونکہ سچا انقلاب نہ تو اس نازک مرحلے پر ملکی مفاد کے لئے نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے نہ فرقہ وارانہ جھگڑوں کو پیدا کرسکتا ہے۔ مرزا افضل بیگ نے انقلاب کو غیر ضروری لوٹ مار، بے جا غارت گری اور ناحق قتل و خون سمجھ رکھا ہے۔ اس لئے وہ سمجھتے ہیں کہ والئے ملک پر اور غیر مسلموں پر کانفرنس نے یہ مہربانی کی کہ اس "انقلابی پروگرام" کو سردست پس پشت ڈال دیا مرزا صاحب اور ان کے رفقاء کو جاننا چاہیے کہ انقلاب ان باتوں سے بہت بلند ایک ایسی چیز ہے جو دنیا کی ترقی چاہنے والوں کا سب سے پاک اور سب سے موثر ہتھیار ہے جس سے وہ سماج کو ترقی کی راہ پر آگے لے جاتے ہیں۔ کوئی نازک مرحلہ ایسا نہیں آسکتا جب انقلاب کو پس پشت ڈال کر سچا حریت پرست اپنے وطن کی صحیح خدمت کرسکتا ہے۔ جس وقت کوئی قوم پرست انقلاب سے منہ موڑتا ہے۔ چاہے وہ کتنے ہی دعوے کرتا پھرے وہ وطن سے غداری کرتا ہے اور دنیا کی ترقی کے لئے سد راہ بن جاتا ہے۔ سوال باقی رہتا ہے کہ انقلاب کیا ہے؟ اس دنیا میں انسان جب سے پیدا ہوا وہ دوسرے انسانوں کے ساتھ مل کر اپنی بہتری و بہبودی کے وسائل ڈھونڈنے میں لگا رہا۔ اس طرح سے سماج کی بنیاد پڑی اور انسانوں کے آپس کے تعلقات قائم ہونے لگے۔ یہ تعلقات انسانی تاریخ کے مختلف دوروں میں بدلتے رہے۔ ایک دفعہ جو تعلقات قائم کئے گئے وہ وقت گذرنے پر فرسودہ بنتے رہے اور انسانی ترقی کے لئے ضروری

ہوا کہ ان کو بدل دیا جائے۔ ان کو بدلنا انقلاب ہے۔ اور جو لوگ ان کے بدلنے کے حق میں ہوں وہ انقلابی ہیں۔ جو ان فرسودہ تعلقات کو قائم رکھنا چاہتے ہوں وہ رجعت پسند اور انسانی ترقی کے دشمن ہیں۔

ہندوستانی سماج کے تعلقات صدیوں سے فرسودہ ہو چکے ہیں۔ ان تعلقات کو تفصیل کے ساتھ یہاں لکھنا ممکن نہیں۔ صرف ایک کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ ہندوستان کی نوے فیصدی سے زیادہ آبادی زمین کی کاشت کاری پر گذارا کرتی ہے۔ لیکن یہ کثیر آبادی اپنی محنت و مشقت کا پورا پھل حاصل نہیں کرپاتی۔ کیونکہ ہندوستان میں جاگیرداروں اور زمینداروں کا ایک طبقہ ہے جو اس کثیر آبادی کی محنت کا استحصال کرتا ہے جب تک یہ تعلق قائم ہے ہندوستان ترقی نہیں کرے گا۔ یہ تعلق زمانہ وسطی سے چلا آتا ہے۔ زمانہ وسطی میں جاگیرداروں اور کاشتکاروں کا ہونا لازمی تھا۔ لیکن اب دنیا کے حالات بدل گئے ہیں۔ اب کاشت کاروں کا جاگیرداروں اور زمینداروں کے دست ظلم سے آزاد ہونا ضروری ہے۔ ورنہ ہندوستان کچھ ترقی نہیں کر سکے گا۔ جو لوگ کاشتکاروں اور جاگیرداروں کے اس تعلق کو توڑنا چاہتے ہیں۔ وہ انقلابی ہیں ۔ جو اس کو قائم رکھنا چاہتے ہیں وہ رجعت پسند ہیں۔ اور ہندوستان کے دشمن ہیں۔ یہی حال دوسرے مسائل کا ہے۔ اب جو شخص سٹیج پر چڑھ کر "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ بلند کرتا ہے لیکن ان سماجی مسائل کی نسبت فرسودہ خیالات کو بھی دہراتا ہے وہ عوام کو گمراہ نہیں کرتا تو اور کیا کرتا ہے؟

انقلاب کے لانے میں ہمیں یہ نہیں دیکھنا ہے کہ ہم تلوار اور بندوق استعمال کرتے ہیں یا نہیں۔ خون کی ندیاں بہتی ہیں یا نہیں۔ ہمیں صرف دیکھنا یہ ہے کہ انسانی سماج کے تعلقات کس طرح بدل سکتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ وہ طبقہ جو پرانے تعلقات کے ہوتے ہوئے برسر اقتدار ہوتا ہے۔ آسانی کے ساتھ ان تعلقات کو ٹوٹنے نہیں دیتا۔ اس لئے جنگ و جدل ضروری ہوجاتی ہے۔ لیکن یہ سمجھنا درست نہیں کہ قتل و خون کے بغیر انقلاب ممکن نہیں۔ خاص کر یہ بتانا کہ انقلاب سے فرقہ وارانہ فسادات کا اندیشہ ہے بہت بھکی بات ہے۔ ۱۸۰۸ء میں فرانس میں حکومت کا تختہ پلٹنا انقلاب تھا۔ لیکن ۱۹۳۶ء میں سپین میں جو لوگ حکومت کا تختہ الٹنا چاہتے تھے وہ انقلاب کے دشمن تھے۔ جاپان میں جاپانی سامراج کو مٹانا انقلاب پرستی ہے لیکن روس میں حکومت کی حمایت کرنا انقلاب پرستی ہے۔ کیونکہ وہاں فرسودہ

تعلقات مٹ کر نئے تعلقات قائم ہو چکے ہیں۔

ہم مرزا محمد افضل بیگ کے ساتھ متفق ہیں کہ نیشنل کانفرنس نے انقلابی پروگرام کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ اس لئے نہیں کہ اس نے حکومت کے ساتھ تعاون کیا بلکہ اس لئے کہ اس نے ملک کی رجعت پسند طاقتوں کے عقائد کو قبول کرلیا۔ اس نے انقلاب کے دشمنوں کا آسرا لیا۔ یہی وجہ تھی کہ کانفرنس نے سرگوپال سوامی آئنگر جیسے دشمن انقلاب کی طرف دست تعاون دراز کیا۔

یہی وجہ ہے کہ میرپور میں کانفرنسی لیڈروں نے ساہوکاروں کی حمایت میں تقریریں کیں۔ ان سے چندہ وصول کرکے کانفرنس کو کامیاب بنایا۔ کانفرنس انقلاب پرور ہوتی تو رجعت پسندوں کو اس میں شامل ہونے کی جرات ہی نہ ہوتی۔

(۸ مئی ۱۹۴۳ء)

☆☆☆

ترقی پرور اور رجعت پسند

ہندوستان میں بہت سی سیاسی سماجی اور مذہبی جماعتیں کام کر رہی ہیں۔ ہر ایک جماعت اپنے آپ کو ترقی پرور سمجھتی ہے۔ اور دوسروں کو رجعت پسند۔ یہی حال قومی کارکنوں اور خاص کر سیاسی کارکنوں کا ہے۔ ہر ایک اپنے آپ کو ترقی پرور مانتا ہے اور اپنے مخالفین کو رجعت پسند کانگریس کا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ اس نے کبھی عوام کو سیاسی تربیت دینے کی ضرورت نہیں سمجھی ۔ اس نے ہندوستانیوں کو سیاسی طور پر بیدار کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کانگریسی لیڈروں نے صرف عوام کے ذہن میں تعصبات اور نسلی و مذہبی منافرت کے بیج بوئے۔ اس لئے ہندوستانیوں نے کبھی نہ سیکھا کہ ترقی پرور کس کو کہتے ہیں۔ اور رجعت پسند کس کو؟ عام کانگرسیوں کا خیال ہے کہ ترقی پرور وہ ہے جو حکومت کا مخالف ہو۔ اور رجعت پسند وہ جو اس کی حمایت کرے۔ اس لئے وہ جتنا حکومت کا مخالف ہو وہ اتنا ہی ترقی پرور ہے اور جتنا اس کا حمایتی ہو اتنا ہی رجعت پسند ہے۔ کانگریسی تمام سیاسی اور غیر سیاسی انجمنوں کو بھی اسی کسوٹی پر چڑھاتے ہیں۔ لیکن ایسا کرنا درست نہیں بلکہ تعصب کی نشانی ہے۔

ترقی پرور کون ہے اور رجعت پسند کون؟ اس کو سمجھنے کے لئے ہمیں یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ ترقی کس کو کہتے ہیں۔

انسان جب دنیا میں پیدا ہوا تو اس کی حالت حیوان سے مختلف نہ تھی۔ وہ ان ہی کی طرح زندگی بسر کرتا تھا۔ لیکن اس نے تجربہ سے سیکھنا شروع کیا۔ اور اسی تجربہ سے قدرت کے رازوں کو معلوم کیا۔ انسان اس علم کی بدولت قدرت کے خزانوں کو اپنی ضرورت زندگی مہیا کرنے کے لئے استعمال کرنے لگا۔ آج سے ہزاروں سال پہلے انسان غاروں میں رہتا تھا۔

حیوانوں کی کھالیں پہنتا تھا۔ اور جنگلی پھلوں پر گذارہ کرتا تھا۔ لیکن وہ آج ایسا نہیں کرتا۔ اس نے عالیشان مکانات تعمیر کرنا سیکھا ہے۔ وہ اپنے لئے مشینوں سے کپڑا تیار کرتا ہے۔ کھیتی باڑی سے اناج اور سبزیاں پیدا کرتا ہے انسان اور حیوان میں اتنا ہی فرق ہے کہ ایک تجربے سے سیکھتا ہے اور قدرت کو آہستہ آہستہ اپنے قابو میں لاکر ترقی کرسکتا ہے۔ دوسرا ایسا نہیں کرسکتا۔ حیوان جس حالت میں آج سے ہزاروں سال قبل تھا اسی میں وہ اب بھی ہے۔ یہ سمجھنا غلطی ہوگی کہ انسان نے جو ترقی اس وقت تک کی ہے وہ یک لخت ہوئی۔ انسان اس حالت تک آہستہ آہستہ ہی پہنچا ہے۔ اور اس ترقی کا سہرا کسی ایک فرد ایک قوم یا ایک ملک کے سر نہیں باندھا جاسکتا۔ اس کے لئے تمام مخلوق عالم ذمہ دار ہے انسان ہر لمحہ ہر مہینہ اور ہر سال ترقی کرتے رہتے ہیں دنیا کے ہر حصے میں تجربے ہوتے رہتے ہیں۔ اور جوں ہی کسی تجربے کی وجہ سے نیا راز کھل جاتا ہے جس کی بدولت انسانوں کے لئے مزید سہولتیں مہیا ہوتی ہیں وہ انسانوں کی مشترکہ جائداد بن جاتی ہے۔ چاہے تجربہ کسی نے کیا ہو۔ ہم اس پر چل کر ترقی کے راستے پر ایک قدم اور آگے بڑھ جاتے ہیں۔

دنیا میں دو قسم کے لوگ ہر وقت موجود ہوتے رہے ہیں۔ ایک وہ جو انسانوں کے متذکرہ صدر تجربوں سے فائدہ اٹھاتے رہے ہیں۔۔ ان کو اپنی زندگی کا جزو بناتے رہے ہیں۔ خود ان پر چلتے رہے ہیں اور دوسروں کو بھی ان پر چلنے کی تلقین کرتے رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کو ترقی پرور کہتے ہیں۔ بدقسمتی سے ان لوگوں کی تعداد ہمیشہ کم رہی ہے۔ اس کے خلاف انسانوں کی اکثریت ابتداء میں جب یہ تجربے کامیابی سے ہوتے رہے ہیں۔ ان پر چلنے سے انکار کرتی رہی ہے۔ یہ لوگ صرف تسلیم شدہ اور مقررہ امور کو ہی صحیح مانتے ہیں۔ نئے تجربوں کو ناپاک قرار دیتے ہیں۔ اور ان کے خلاف جہاد شروع کردیتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کو رجعت پسند کہا جاتا ہے اگر دنیا میں رجعت پسندوں کی فتح ہوئی ہوتی، تو انسان آج غاروں میں حیوانوں کی کھالیں پہن کر جنگلی پھلوں پر گذارہ کرتا ہوتا۔ لیکن انسان پیدا ہی اس لئے ہوا کہ بے انتہا ترقی کرتا جائے۔ اس لئے گو ترقی پروروں کی تعداد ابتداء میں کم ہوتی ہے۔ بے شمار رجعت پسندوں کی زبردست مخالفت کے باوجود انجام کار وہی فتح یاب ہوجاتے ہیں۔

گذشتہ سات سو سال میں سائنس کی ترقی میں جو روڑے اٹکائے گئے۔ گلیلیو' برنو' کاپر نیکس اور ایسے ہی اپنے درجنوں محسنوں کے ساتھ انسانوں نے جو انسانیت سوز

سلوک کیا وہ رجعت پسندوں کے کارہائے نمایاں کا سیاہ ترین باب ہے۔ لیکن آج کون ہے جو تسلیم نہیں کرتا کہ اگر یہ محسن پیدا نہ ہوئے ہوتے تو انسان نے ترقی کی ہوتی؟ ا.ر وہ مہذب ہوگیا ہوتا؟ گلیلیو' برنو' کاپر نیکس کو رجعت پسندوں نے انتہائی اذیتیں دیں۔ برنو کو زندہ جلایا گیا' گلیلیو اور کاپر نیکس کو قید میں ڈالا گیا۔ آج تسلیم کیا جارہا ہے کہ وہ انسانوں کے بہت بڑے ہمدرد تھے۔ ان کو جن باتوں کے لئے سزائیں اور اذیتیں دی گئیں' کسی کی جرات نہیں کہ غلط قرار دے۔ لیکن پھر بھی دنیا میں رجعت پسند موجود ہیں۔ اب وہ گلیلیو ۔ برنو اور کاپر نیکس کی بتائی ہوئی باتوں کی مخالفت نہیں کرتے۔ بلکہ موجودہ دنیا کے گلیلیو ۔ برنو اور کاپر نیکس کی باتوں کی مخالفت کرتے ہیں مختصر یہ ہے کہ آج کل کے رجعت پسند اپنے پیشروؤں کے انجام سے کچھ بھی سیکھنا نہیں چاہتے۔

رجعت پسندوں کا پروگرام ہمیشہ سے یہی چلتا آیا ہے کہ وہ نئی ایجاد' نئے خیال' نئے عقیدہ اور ترقی کے مخالف رہیں۔ اس لئے جب ہمیں دیکھنا ہو کہ وطن کی فلاں جماعت یا لیڈر یا عام آدمی ترقی پرور ہے یا رجعت پسند تو ہمیں اس کو اس کسوٹی پر گھس کر پرکھنا چاہیے۔ ہمیں تعصب یا نسلی یا مذہبی منافرت کو دور پھینکنا چاہیے۔ ہمارے وطن کی سب سے بڑی سیاسی جماعت نیشنل کانگریس گاندھیت کے اثر میں ہے۔ مہاتما گاندھی کا عقیدہ ہے کہ مشین شیطان کی ایجاد ہے۔ ہندوستان کی ترقی کا راز اسی میں پوشیدہ ہے کہ وہ اسی حالت پر پہنچ جائے جو اس ملک میں آج سے ہزاروں سال پہلے تھا۔ انہوں نے ہندوستانیوں کو ہاتھوں سے بنا ہوا اور کتا ہوا کپڑا پہننا سکھایا۔ وہ سادگی کو پسند فرماتے ہیں۔ اور سادگی کا مطلب یہ ہے کہ جو بھی ایجادیں ہوئی ہیں۔ ان کو چھوا تک بھی نہ جائے ۔ مہاتما گاندھی مڑمڑ کر پیچھے کی طرف دیکھتے ہیں۔ آگے کی طرف نہیں۔ وہ میڈیکل سائینس سے نفرت کرتے ہیں۔۔ ان کا بس چلتا تو وہ انسانوں کو شاید پھر غاروں میں ننگا رہ کر جنگلی پھلوں پر گزارہ کرنے کی تلقین کرتے ۔ جن لوگوں نے ان کی تحریر کا شاہکار "ہند سوراجیہ" نامی کتاب پڑھا ہوگا ان کے لئے ایسے نتائج اخذ کرنا مشکل نہیں۔ یہ ہندوستان کی خوش قسمتی ہے کہ اس بیسویں صدی میں ان کا پرچار کامیاب نہ ہوسکتا تھا۔ لیکن انہوں نے اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔

ہمارے متذکرہ صدر نظریہ کو سامنے رکھ کر یہ دیکھنا مشکل نہیں کہ حکومت برطانیہ کی شدید مخالفت کرنے کے باوجود مہاتما گاندھی اس ملک میں سب سے بڑے رجعت پسند واقع ہوئے ہیں۔ اور جب تک کانگریس ان کے زیر اثر ہے وہ ہندوستان کی سب سے بڑی رجعت پسند جماعت ہے۔ اگر ہمارے وطن کو سماجی اور سیاسی طور پر آزاد ہونا ہے اور ہندوستانیوں کو سائنس کی پیدا کردہ نعمتیں حاصل کر کے اپنی زندگی کا معیار بلند کرنا ہے تو گاندھیّت کو مٹانا ہمارا پہلا فرض ہے۔ ہمیں اس کی جگہ ترقی پرورانہ خیالات کو پھیلانا ہے اور رجعت پسندی کا خاتمہ کرنا ہے۔

(۶ اگست ۱۹۴۳ء)

جمہور کا ترجمان کون؟

ریاست کشمیر کی موجودہ "مقتدر" سیاسی انجمنوں میں سے کوئی بھی جمہور کی ترجمان نہیں ہوسکتی۔ نیشنل کانفرنس کے بلند بانگ دعوی کے باوجود اس کی حالت بھی وہی ہے جو دوسری رجعت پسند سرمایہ دار اور فرقہ وارانہ انجمنوں کی۔ صرف "نیشنل" نام رکھنے سے ان انجمن کو حق حاصل نہیں کہ جمہور کی نمائندگی کا دعوی کرسکے ۔ جب تک بنیادی طور پر سماجی مسائل کی نسبت یہ جماعت بھی ان ہی اصولوں پر کھڑی ہے جن پر دوسری جماعتیں۔ اس وقت تک گمراہ کن نعرے لگانے یا اپنا نام غیر فرقہ وارانہ دکھلانے سے اس کو جمہوریت پرست جماعت نہیں مانا جاسکتا۔ انڈین نیشنل کانگریس کو بھی یہی غلط فہمی ہوگئی تھی کہ چونکہ اس کا نام غیر فرقہ وارانہ ہے وہ اپنے جلسوں جلوسوں میں جمہور پرستانہ نعرے بلند کرتی ہے اور اس کے لیڈر اپنی تقریروں میں عوام کے لئے ٹسوے بھی بہاتے ہیں۔ بس اسی لئے یہ جماعت عوام کی ترجمان ہے۔ لیکن دنیا نے دیکھ لیا کہ جب بین الاقوامی سیاسیات میں بحران آیا۔ اس وقت اس جماعت کی حقیقت آشکارا ہوگئی۔ اس نے مخالف انقلاب ہوکر رجعت پسندی اور سرمایہ داری کا جھنڈا بلند کیا۔ اور عوام کے مفاد کے ساتھ غداری کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کانگریس نے مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں سماجی انقلاب کے بنیادی اصولوں کو نہ اپنایا۔ گاندھیت رجعت پسندی، کا فلسفہ ہے۔ یہ فلسفہ انقلاب کا دشمن ہے اور سرمایہ داری کی حمایت کرتا ہے۔ مہاتما گاندھی نے سرمایہ داری اور جاگیرداری کو کھلم کھلا بار بار سماج کے لئے ضروری بتایا ہے۔

سوال یہ ہے کہ جمہور کا ترجمان کس کو تسلیم کیا جانا چاہیے؟ ہمارے ملک میں اس کی نسبت ایک بڑی غلط فہمی پائی جاتی ہے جس کو دور کرنا ضروری ہے۔ اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ وہی شخص یا پارٹی جمہور کی ترجمان مانی جاسکتی ہے جو سب کی چاہتی ہو۔ یہ سراسر غلط ہے۔ ہر دلعزیز یا سب کی چاہتی ہونے کا مطلب جمہور کا حقیقی ترجمان ہونا نہیں۔ تاریخ عالم بتاتی

ہے کہ بسا اوقات جمہور کے ترجمان بھی جمہور میں ایک عرصہ کے لئے ہر دلعزیز بنے رہے ہیں۔ کیونکہ ہر دلعزیزی صرف سچی ترجمانی کرنے سے حاصل نہیں ہوتی۔ عوام کو گمراہ کرنے سے بھی "ہر دلعزیزی" حاصل ہو سکتی ہے۔ موجودہ زمانے میں اس کی سب سے بڑی مثال ہٹلر کی پیش کی جاسکتی ہے۔ ہٹلر جرمنوں میں "ہردلعزیز" ہے۔ اس لئے نہیں کہ وہ جرمن جمہور کے مفاد کا ترجمان ہے۔ بلکہ اس لئے کہ اس نے بڑی عیاری سے ان میں اس طریقے پر پروپیگنڈا کیا ہے کہ غریب جرمنوں کو پتہ نہیں کہ ان کا دشمن کون ہے؟ دوست کون؟ ہٹلر سرمایہ داروں کا ترجمان ہے۔ پروپیگنڈا کے تین بڑے ذرائع یعنی اخبارات۔ مدارس اور گرجے ہر جگہ سرمایہ داروں کے قبضہ میں ہوتے ہیں۔ جرمنی کے سرمایہ داروں نے یہ ذرائع ہٹلر کو مہیا کر رکھے ہیں۔ اور ان کے ذریعہ سے وہ جرمن عوام میں خوب پروپیگنڈا کرتا رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہٹلر ان میں "بڑا ہر دلعزیز" ہے۔ لیکن اس کے باوجود جو ہم ہٹلر کے پروپیگنڈا کا شکار نہیں اچھی طرح جانتے ہیں کہ آنے والی دنیا میں جرمنی کا غیر جانب دار تاریخ نویس ہٹلر کو جرمنوں کا سب سے بڑا دشمن قرار دے گا۔ کیونکہ وہ اپنے فلسفہ حیات کی وجہ سے جمہور کے حقیقی مفاد کا شدید ترین دشمن تھا۔ اور جرمنی کے سرمایہ داروں کا آلہ کار۔

مقتدر انجمنوں کو صرف ہر دلعزیزی کی وجہ سے جمہور کا ترجمان ماننا ایک ایسا سیاسی اصول ہے جو فرسودہ ہو چکا ہے اور جس کو انقلاب روس کے بعد کوئی وقعت نہ دینی چاہیے۔ کیونکہ آج کل اس اصول پر کاربند رہ کر سرمایہ داری کو زندہ رکھا جاسکتا ہے۔ ہمارا مطلب یہ نہیں کہ جمہور کی ترجمانی جماعت کے لئے ہر دلعزیز ہونا بری بات ہے۔ یا اس کو ہر دلعزیز ہونے کی کوشش نہ کرنی چاہیے۔ یا وہ ہر دلعزیز ہونا بری بات ہے۔ یا اس کو ہر دلعزیز ہونے کی کوشش نہ کرنی چاہیے۔ یا وہ ہر دلعزیز نہیں ہوتی۔ ہمارا مطلب یہ ہے کہ صرف "ہر دلعزیز" ہونا ہی اس بات کا ثبوت نہیں کہ جماعت عوام کی حقیقی ترجمان ہے۔ سب سے پہلی بات جو جماعت کو حقیقی ترجمان بنا سکتی ہے یہ ہے کہ وہ عوام کے مفاد کی ترجمان ہو۔ اور اس مفاد کے لئے سرگرم عمل رہے۔

اس سلسلہ میں ہمیں دیکھنا چاہیے کہ ہندوستان کے جمہور کا مفاد کس میں ہے؟ ہندوستان کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ جب دنیا سرمایہ دارانہ دور سے گذر کر اشتراکی

دور میں آنا چاہتی ہے۔ ہندوستان ابھی جاگیر دارانہ دور میں ہے۔ ہمارے ملک میں ابھی پرانے سماجی نظام کو بدلا نہیں گیا۔ جب تک اس نظام کو بدلا نہیں جاسکتا ہمارا ملک نہ تو صحیح معنوں میں آزاد ہوگا نہ ترقی کرسکے گا۔ جمہور کا مفاد اس میں ہے کہ ایک سماجی انقلاب کے ذریعہ سے ہی ہمارے ملک میں جاگیردارانہ دور کو ختم کردیا جائے۔ اس کے لئے سیاسی اصطلاحات کی ضرورت نہیں۔ ایک انقلاب کی ضرورت ہے۔ مثلاً" جاگیردارانہ دور کا ایک سماجی اصول یہ ہے کہ جاگیردار زمین کا مالک ہو۔ وہ گھر پر بیکار رنگ رلیاں مناتا رہے۔ سال بھر کبھی اپنی زمین کو دیکھے بھی نہیں۔ زمین کو کاشت کرنے کے لئے کسان کام کریں۔ لیکن پھل پکنے پر جاگیردار اس کا بیشتر حصہ ان سے چھین لے ہمارے ملک کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ جس سماجی نظام میں یہ اصول کار فرما ہے وہ ختم ہو۔ زمین کے مالک خود کاشتکار ہوں تاکہ جمہور اپنی محنت کا پورا پھل حاصل کرسکیں۔ یہی جمہور کے مفاد کی حقیقی ترجمانی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ہمارے ملک میں زمینداروں اور جاگیرداروں کا زور ہے۔ سماج پر ان کا بھاری اثر و رسوخ ہے۔ وہ اس انقلاب کو بپا نہ ہونے کی کوشش کریں گے۔ وہ سیاسی اصلاحات کے مخالف نہیں رہیں گے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ جب تک ان کا اثر و رسوخ ملک میں موجود ہے سیاسی اصلاحات ان کے ہی طابع رہیں گی بلکہ سیاسی اصلاحات سے وہ اپنی پوزیشن مضبوط بناسکیں گے۔ اس لئے وہ عوام کو گمراہ کرنے کے لئے ان سیاسی اصلاحات کو بڑھ چڑھ کر ثابت کرتے ہیں اور ان ہی کو انقلاب بتاتے ہیں۔ جاگیردار اور زمیندار ایسی انجمنوں کی حمایت بھی کرتے ہیں جو ان سیاسی اصلاحات کے حق میں ہوں۔ لیکن وہ اس بات پر خوب نظر رکھتے ہیں کہ ایسی انجمنیں سماجی انقلاب کے بنیادی اصولوں کو نہ اپنائیں۔ جاگیرداروں اور زمینداروں کی حمایت کی وجہ سے یہ انجمنیں "ہردلعزیز" بن جاتی ہیں۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ کسی طرح بھی جمہور کی نمائندہ نہیں مانی جاسکتی ہیں۔ کیونکہ یہ ان کے مفاد کی ترجمان نہیں۔

ہندوستان کی انڈین نیشنل کانگریس اور کشمیر کی نیشنل کانفرنس اسی قسم کی انجمنیں ہیں جو سماجی انقلاب کے بنیادی اصولوں کو تسلیم نہیں کرتیں۔ صرف سیاسی اصلاحات کو بڑی وقعت دیتی ہیں۔ اسی لئے سرمایہ داروں۔ جاگیرداروں۔ زمینداروں اور رجعت پسندوں میں ہردلعزیز ہیں۔ اور گمراہ کن نعروں اور پروپیگنڈے کی بدولت جمہور میں بھی کافی اقتدار حاصل کرچکی

ہیں۔

جمہور کا ترجمان وہی ہے جو جمہور کے مفاد کی ترجمانی کرے جس کا نصب العین سماجی انقلاب ہو۔ ایسے خیالات اور عقائد کی نشر و اشاعت کرتا ہو جو اس انقلاب کو قریب کر سکے۔ جو عمل سے اس پروگرام پر کاربند ہو جس سے اس انقلاب کو تقویت حاصل ہو۔ چاہے وہ ہر دلعزیز ہو یا غیر ہر دلعزیز۔ اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ جب لینن اور اس کے رفقاء نے اس صدی کی ابتداء سے لے کر ۱۹۱۷ء تک روس میں سماجی انقلاب کا جھنڈا بلند کیا تو وہ غیر ہر دلعزیز تھے۔ روس میں دوسری پارٹیاں کام کر رہی تھیں۔ وہ ہر دلعزیز تھیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ ۱۹۱۷ء میں انقلاب روس کے موقع پر بھی بالشویک پارٹی دوسری پارٹیوں کی نسبت کم ہر دلعزیز تھی۔ کیا اس سے یہ کہا جاسکتا تھا کہ لینن اور اس کے رفقاء عوام کے صحیح ترجمان نہ تھے۔ لینن اس وقت بھی روسی جمہور کا سچا نمائندہ تھا۔ جب اس نے ۱۸۹۸ء میں روس کے اندر سماجی انقلاب بپا کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ حالانکہ اس وقت اس کے ساتھ تقریباً" کوئی بھی نہ تھا۔ وہ اکیلا تھا۔ اور جمہور میں غیر ہر دلعزیز تھا۔ اس کے مقابلہ پر روس کی سرمایہ دارانہ جماعتیں عوام میں بڑا اثر و رسوخ رکھتی تھیں۔ پھر بھی چونکہ لینن کا نصب العین اور پروگرام عوام کے مفاد کے عین مطابق تھے اس لئے وہ ان کا حقیقی ترجمان تھا۔

ہندوستان میں ہمیں ایسے ہی لیڈروں اور ایسی ہی پارٹی کی ضرورت ہے۔ جو عوام کے حقیقی مفاد کے لئے لڑتی رہے۔ ہم نے دیکھا کہ یہ مفاد ایک ہی بات میں مضمر ہے کہ ملک میں سماجی اور سیاسی انقلاب ہو۔ جو پارٹی اور جو لیڈر اس انقلاب کے بنیادی اصولوں کو مانتے ہوں۔ ان کو پھیلانا اپنا سب سے پہلا کام سمجھتے ہوں۔ اور ان پر خود عمل کرتے ہوں۔ وہ چاہے غیر ہر دلعزیز ہی کیوں نہ ہوں عوام کے سچے ترجمان ہیں۔ دوسرے لوگ نہیں۔ یہی سچی جمہوریت ہے۔

(۲۸ جولائی ۱۹۴۳ء)

☆☆☆

ہندوستان کا نصب العین

تاریخی واقعات نے ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے سامنے مختلف نصب العین رکھے ہیں۔ موجودہ دور میں ہندوؤں کا جو نصب العین ہے وہ مسلمانوں کا نصب العین نہیں۔ اور جو مسلمانوں کا نصب العین ہے وہ ہندوؤں کا نصب العین نہیں۔ ہندو چاہتے ہیں کہ انگریزوں کو ملک سے نکال کر ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کردیں۔ وہ اس حکومت میں کسی کو بھی حصہ دینے کے خواہاں نہیں۔ زبان سے وہ جو کچھ کہیں حقیقت یہ ہے کہ ہندو ہندوستان کی حکومت میں مسلمان کو حصہ دار نہیں بنانا چاہتے۔ اس لئے ان کا نعرہ ہے۔ "انگریزوں کو نکال دو۔ پورن سوراجیہ قائم کرو۔ اور ہندوستان کو اکھنڈ رکھو۔" اس کے خلاف مسلمانوں کا نصب العین یہ ہے کہ "منظم ہوجاؤ اور اپنی ملی مضبوطی کی بنیاد پر ہندو سے ٹکر لو۔ اس کو ذہن نشین کرادو کہ وہ اپنی من مانی نہیں کرسکتا۔ وہ ہندوستان میں حکومت کرسکتا ہے تو مسلمان کے ساتھ شراکت سے۔ ورنہ نہیں۔" اس نصب العین کے ہوتے ہوئے مسلمان نہیں چاہتا کہ انگریز ہندوستان سے چلا جائے۔ کیونکہ ہندو منظم ہے۔ طاقت ور ہے اور اس کے پروپیگنڈا کے ذرائع وسیع ہیں۔ مسلمان ڈرتا ہے کہ اگر انگریز ہندوستان سے چلا گیا تو وہ ہندو کے ساتھ نہ لڑ سکے گا۔ اس لئے وہ انگریز کے ساتھ اس وقت نبرد آزما نہیں ہونا چاہتا۔ جب ہم کہتے ہیں کہ ہندو کا نصب العین انگریز کو نکالنا اور اپنی حکومت قائم کرنا ہے یا مسلمان کا نصب العین ہندو کے خلاف لڑنا اور اس سے اپنی جداگانہ ہستی کو منوانا ہے تو اس وقت ہمارا مطلب نہ ہندو جمہور سے ہوتا ہے نہ مسلمان جمہور سے۔ بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیانی یا بالائی طبقوں سے ہوتا ہے۔ کیونکہ آج کل ہندوستان کی سیاسیات جمہور کی سیاسیات نہیں۔ جمہور ہندوستان میں بیدار نہیں ہوئے ہیں۔ سیاسی طور پر وہ بالکل سوئے ہوئے ہیں۔ سیاسیات کو چلانے والے تعلیم یافتہ لوگ ہیں جو درمنی اور بالائی طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ جمہور اس وقت ان ہی بالائی طبقوں کے پروپیگنڈا کا شکار ہیں۔ وہ جس

طرف انہیں چاہیں اس طرف لے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کے ہندو عوام اور مسلمان عوام آج کل سیاسیات میں اس طرح ہانکے جا رہے ہیں کہ وہ اپنی حرکتوں سے اپنے پاؤں پر کلہاڑا مارتے رہتے ہیں۔ سرمایہ دار ان سے جو کرانا چاہتے ہیں کرا رہے ہیں۔ جس مسئلے کے حق میں رائے دلوانا چاہتے ہیں دلوا رہے ہیں۔ کانگریس پر ہندو سرمایہ داروں کا قبضہ ہو چکا ہے۔ انہوں نے ہندو عوام کے اندر یہ ذہن نشین کرادیا ہے کہ انگریز کا ہندوستان سے نکال دینا ضروری ہے۔ ہندوستان کا اکھنڈ رہنا ضروری ہے وغیرہ اور ہندو عوام بھی ان ہی باتوں کو ہر جگہ دہراتے رہتے ہیں۔ حالانکہ اگر بغور دیکھا جائے تو اس سے ہندو سرمایہ داروں کا فائدہ حاصل کرنا مقصود ہے۔ ہندو عوام کا نہیں۔ اسی طرح مسلم لیگ کے اندر مسلم سرمایہ داروں کا غلبہ ہے۔ وہ لوگ عوام کو پڑھا رہے ہیں کہ ہندو اور مسلمان آپس میں اکھٹے نہیں رہ سکتے۔ یہ دونوں علیحدہ علیحدہ قومیں ہیں۔ ان کے مفاد جدا جدا ہیں۔ ان کا تمدن جدا جدا ہے اس لئے ہندوؤں کو مسلمانوں سے الگ ہونا چاہیے۔ اسی لئے پاکستان کی ضرورت ہے نتیجہ کے طور پر مسلمان عوام آج کل ان ہی باتوں کو دہرا رہے ہیں۔ حالانکہ ان سے مسلم سرمایہ داروں کا فائدہ حاصل کرنا مقصود ہے مسلمان عوام کا نہیں۔

سوال یہ ہے کہ پھر عوام کا نصب العین کیا ہے۔ ان کو کس بات سے فائدہ ہے۔ عوام کا نصب العین ہندوستان کی حقیقی آزادی ہے۔ اس آزادی کی بنیاد اس بات پر ہے کہ ہر ملیک انسان مکمل طور پر آزاد ہو۔ یعنی ایک انسان دوسرے انسان کی محنت و مشقت کا پھل نہ چھین سکے۔ ایسا سماجی اور سیاسی نظام قائم ہو کہ ایک آدمی جو محنت کرے اس محنت کا پھل اس کو پورا پورا حاصل ہو۔ یہ نہ ہو کہ نکمے لوگ صرف اچھے گھرانوں میں جنم لینے کی وجہ سے عیش و عشرت کریں۔۔ موج اڑائیں۔ جس طرح کہ آج کل ہندوستان میں جاگیردار، زمیندار اور سرمایہ دار کر رہے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی کروڑوں لوگ شب و روز محنت کرنے کے باوجود فاقہ مریں یا مفلوک الحالی سے دن بسر کریں۔ جیسا کہ کشمیر سے لے کر راس کماری تک اور بنگال سے لے کر گجرات تک ہر جگہ دیکھنے میں آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی آزادی نہ تو کانگریس ہندوستان کو دلانا چاہتی ہے نہ مسلم لیگ۔ کیونکہ دونوں انجمنوں میں باوجود ان کے مشتہرہ اعلانات کے جاگیرداروں زمینداروں اور سرمایہ داروں کا غلبہ ہے۔ یہ لوگ اپنی موت کا پروانہ خود نہیں لکھ سکتے۔ ان لوگوں سے یہ امید کرنی کہ اس

آزادی کے حق میں آواز بلند کریں گے جس سے ان کے اپنے مفاد خطرے میں پڑ جائیں ناممکن ہے۔

ہندوستان کا سچا نصب العین نہ تو کانگریس کا موجودہ نصب العین ہوسکتا ہے نہ مسلم لیگ کا نصب العین ہوسکتا ہے، اس کا نصب العین وہ ہوسکتا ہے جو کروڑوں انسانوں کو حقیقی آزادی دلا سکے۔ "انگریز ہندوستان سے چلا جانا چاہیے۔" وغیرہ سوالات اسی ایک نصب العین کو سامنے رکھ کر حل ہوسکتے ہیں۔ مثلاً" اگر ہندوستان کی حقیقی آزادی کے لئے ضروری ہے کہ پاکستان قائم ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس کے قائم ہونے کے بغیر ہم وطن کی حقیقی آزادی کی طرف قدم نہیں بڑھا سکتے۔ تو ہم کو اس کے قبول کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہونی چاہیے۔ ہندو سرمایہ دار آسمان سر پر اٹھائیں۔ کانگریس لاکھ کہے کہ ہندوستان کو منقسم نہیں کیا جاسکتا۔ ہمیں پروا نہیں کرنی چاہیے اور دلیری کے ساتھ قدم آگے بڑھانا چاہیے۔ اسی طرح ہم جانتے ہیں کہ ہندوستان ایک قوم ہے۔ ہندو جمہور اور مسلم جمہور میں کوئی فرق نہیں۔ ان کے اقتصادی مسائل ایک ہیں۔ ان کے سماجی مسائل ایک ہیں۔ سیاسی مسائل ایک ہیں۔ ان کا تمدن ایک ہے۔ اور انہیں ایک ہوکر رہنا ہے۔ یہ نظریہ مسلم لیگ کے نظریہ کے خلاف ہے۔ لیکن ہمیں اس کو پیش کرنے اور اپنانے سے نہیں ڈرنا چاہیے۔ غرضیکہ کانگریس کے نصب العین اور نظریہ میں جو جو باتیں صحیح دکھائی دیں ان کو اپنانا چاہیے۔ اسی طرح مسلم لیگ کے نظریہ میں جو بات درست معلوم ہو اس کو تسلیم کرنے سے نہ ڈرنا چاہیے۔ آج کل سرمایہ داروں کے پرچار کی بدولت ہم جذبات کی رو میں بہے جارہے ہیں۔ جو کچھ وہ ہمیں سکھلا رہے ہیں اسی کو ہم دہراتے جاتے ہیں۔ یہ ٹھیک نہیں۔ اس سے حقیقی قوم پرستی کی تحریک مضبوط نہیں بن سکتی۔ ہندوستان آزادی کی طرف قدم نہیں بڑھا سکتا۔ آج کل ہندو اخبارات اور ہندو جلسوں میں مسلم لیگ اور مسٹر جناح کو برا بھلا کہا جاتا ہے۔ اور مسلم پالٹکس کو اچھوت سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کے اخبارات اور مسلمانوں کے جلسوں سے نیشنل کانگریس اور مہاتما گاندھی کو گالیاں دی جارہی ہیں۔ ہنود اور مسلمان اپنی اپنی جگہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ ہی سچے ہیں۔ دوسرے جھوٹے اور مکار، فریبی ور دغا باز ہیں۔ یہ سب غلط ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ قوم کی قوم گمراہ نہیں ہوسکتی۔ جب تک کوئی وجہ نہ ہو۔ کانگریس نے غلطیاں کیں۔ اس نے انجام کار ہندو سرمایہ

داروں کی نمائندگی کی ترجمانی کا بیڑا اٹھایا۔ اس سے مسلم لیگ قائم ہوئی۔ ہندو سرمایہ داروں کا غرور توڑنے کے لئے مسلم لیگ نے اپنا نصب العین بنایا۔ دونوں کے نصب العین ادھورے ہیں یہ ہندوستان کی حقیقی آزادی کے نصب العین نہیں۔ ہندوستان کا سچا قوم پرست وہی ہوسکتا ہے جو ان دونوں کو پوری طرح سمجھے۔ ان میں جو چیزیں ایسی ہیں جو ہندوستان کو سچی آزادی کی طرف لے جاسکتی ہیں ان کو اپنائے۔ اور جو چیزیں غلط ہیں ان کو ترک کردے۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے پروپیگنڈا کے سیلاب میں بہنے کے عوض بہتر یہ ہے کہ ہندوستان کے نوجوان اور دیش بھگت اپنی آزاد رائے قائم کریں۔ جمہور کو بیدار کریں۔ انہیں حقیقی آزادی سے واقف کرائیں۔ اور اسی آزادی کو حاصل کرنے کے لئے راستہ دکھائیں۔

(۱۳ جون ۱۹۴۳ء)

گاندھی ازم اور جناح ازم

ہندوستان کی قوم پرست تحریک میں ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس میں سیاسیات کو مذہب کے ساتھ خلط ملط کیا جاتا ہے۔ مہاتما گاندھی سے قبل اس میں یہ کمزوری موجود نہ تھی۔ اس لئے اس وقت تک اس کی ترقی صحیح طریق پر ہوتی رہی۔ لیکن جب سے مہاتما گاندھی کانگریس میں آگئے۔ اور قوم پرست تحریک کے قائد اعظم بن گئے اس پر مذہب کا رنگ چڑھ گیا۔ گاندھی جی جو بھی کام کرتے ہیں اس میں انہیں ایشور کا ہاتھ دکھائی دیتا ہے۔ ایک پرائیویٹ فرد کی حیثیت سے کسی کو ان کے اس پورن وشواس پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔ لیکن جب وہ اپنے اس یقین کو ملک کے سیاسی اور اقتصادی مسائل کے حل کرنے کے وقت بھی معرض بحث میں لاتے ہیں تو معاملہ پیچیدہ ہوجاتا ہے۔ سیاسیات کی بنیاد اقتصادیات پر نہیں رہتی بلکہ الہیات پر جا کھڑی ہوتی ہے۔

مہاتما گاندھی کو سائنس اور موجودہ تہذیب پر کوئی بھروسہ نہیں۔ وہ اس کے شدید ترین مخالف ہیں۔ وہ دنیا میں وہی زمانہ پھر واپس لانا چاہتے ہیں جو آج سے ہزاروں سال قبل تھا۔ وہ پراچین سبھیتا کے بڑے شیدائی ہیں۔ قومی لیڈر کی حیثیت سے انہوں نے ان باتوں کو ہندوستان کے پالیٹکس میں بھی دھر گھسیٹا ہے مہاتما جی کی اس تعلیم کی وجہ سے کانگریس پر احیائے حیات (Reviva Lism) کا گہرا اثر پڑا۔ پسماندہ اور غلام ملکوں کے باشندوں کی یہ ایک خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے حال اور مستقبل کا خیال کرنے کی بجائے اپنے گئے گذرے ماضی کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ وہ حال کو کوستے رہتے ہیں۔ مستقبل کا کوئی فکر نہیں کرتے۔ فقط ماضی کی "شاندار" باتیں سن کر اور سنا کر دل کو بہلاتے رہتے ہیں۔ جب مہاتما گاندھی نے ہندوستان کے سماج پر پرانی تہذیب اور پراچین سبھیتا کو واپس لانے کے سبز باغ دکھانے شروع کئے تو اس سے پسماندہ اور غلام ہندوؤں کے دلوں میں ایک ولولہ پیدا ہوا۔ وہ گاندھی جی کو اوتار سمجھنے لگے۔ اور لاکھوں کی تعداد میں ان کے مرید بن گئے۔ لیکن اس کے

ساتھ ہی گاندھی جی کے اس پرچار نے غیر ہندوؤں خصوصاً" مسلمانوں کو خوف زدہ کردیا۔ وہ سمجھنے لگے کہ اگر مہاتما جی کی تحریک کامیاب ہوگئی تو ان کی اسلامی سبھیتا اور اسلامی تہذیب و تمدن کا خاتمہ ہوجائے گا۔ اس لئے وہ تحریک حریت سے آہستہ آہستہ علیحدہ ہونے لگے۔

اگر کانگریس میں مذہب کو خلط ملط نہ کیا جاتا۔ اور اس کو اسی طرح ملک کے سیاسی اور اقتصادی مسائل کے حل کرنے کے لئے خالص قومی انجمن رہنے دیا جاتا۔ جیسا کہ یہ گاندھی جی کے نمودار ہونے سے پہلے تھی تو ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کے درمیان اختلافات کی خلیج وسیع نہ ہوئی ہوتی۔ جیسی کہ اب ہوگئی ہے۔ کیونکہ اس صورت میں کانگریس ہی تمام باشندگان ملک کی نمائندہ انجمن ہوتی۔ اس کے اندر ہی تمام فرقوں کے لوگ اپنی مشکلات۔ مصائب اور تکالیف کا حل پاتے اور اس کو ہی آزادی حاصل کرنے کا ذریعہ مانتے۔ لیکن گاندھی جی نے کانگریس کو ہندوستان کی سیاسی انجمن نہیں رہنے دیا۔ انہوں نے اس کو اپنی مذہبی اور روحانی تجربہ گاہ بنایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اس سے دور ہوئے اور ان کے دلوں میں بڑی بھاری بے چینی پیدا ہوئی۔ جب حالت اس حد تک پہنچی تو قدرت نے مسلمانوں کے ان حقیقی جذبات اور احساسات کو ظاہر کرنے کے لئے ایک وسیلہ پیدا کیا۔ اور وہ وسیلہ مسلم لیگ اور اس کے لیڈر مسٹر جناح ہیں۔ صاف ہے کہ مسلم لیگ اور مسٹر جناح کو تاریخی واقعات نے اسی طرح پیدا کیا جس طرح کانگریس اور مہاتما جی کو پیدا کیا تھا۔

ہندوؤں کا خیال ہے کہ اگر مسٹر جناح اور مسلم لیگ کا وجود ہندوستانی پالیٹکس میں نہ ہوتا تو اس وقت ہمارا وطن آزاد ہوجاتا۔ انگریز یہاں سے چلے جاتے۔ اور نہ کہیں ہندو مسلم جھگڑا باقی رہتا نہ برطانوی سامراج۔ فرقہ پرستوں کی بات تو جانے دیجئے۔ قوم پرست ہندوؤں کو بھی اس بات کا پورا یقین ہے کہ مسٹر جناح اور مسلم لیگ انگریزوں کے پیدا کردہ ہیں۔ اگر انگریز دونوں کے پشت پناہ نہ رہیں تو ان کا کہیں وجود نہ رہے گا۔

ہمیں قوم پرستوں کے یہ دلائل بچوں کی سی باتیں دکھائی دیتی ہیں۔ ہماری رائے ہے کہ مسٹر جناح اور مسلم لیگ کو پیدا کرنے والے خود مہاتما گاندھی۔ ان کا فلسفہ حیات اور طریق کار ہیں۔ اگر انہوں نے کانگریس میں سیاسیات اور مذہب کو خلط ملط نہ کیا ہوتا اور ہندوستانیوں کے سامنے پرانی تہذیب اور پراچین سبھیتا کو واپس لانے کا پروگرام نہ رکھا ہوتا۔ اگر وہ دنیا کے دوسرے سیاسی لیڈروں کی طرح ملک کی ترقی کے لئے مٹی اور چرخے کے

بدلے سائنس اور ترقی یافتہ صنعت و حرفت کا اعلیٰ ترین معیار رکھتے تو مسلمان کبھی بھی کانگریس سے بدظن نہ ہوتے۔ اور انہیں ضرورت نہ پڑتی کہ وہ اپنی سیاسی انجمن علیحدہ بناتے یا اپنے آپ کو ہندوؤں سے ایک دوسری الگ قوم سمجھتے۔ اس وقت یہ باتیں اور یہ خیالات مسلمانوں کے دماغ میں نہ آسکتے تھے۔ اور اگر کوئی شخص ایسے خیالات کو پھیلانے کی کوشش بھی کرتا تو اس کی کوئی نہ سنتا۔

قوم پرست ہندو حیران ہوتے ہیں کہ مسٹر جناح کی اپیل میں مسلمانوں کے لئے اتنی کشش کیوں ہے؟ وہ نہیں سمجھتے کہ پاکستان کا نصب العین مسلمانوں کے لئے کیوں اتنا دلکش اور دلاویز بن گیا ہے۔ وہ جتنی کوشش کرتے ہیں کہ پروپیگنڈا کے ذریعہ پاکستان۔ مسلم لیگ اور مسٹر جناح کو مسلمانوں میں غیر ہر دلعزیز بنائیں اتنے ہی یہ تینوں ان میں روز بروز زیادہ مقبولیت حاصل کرتے جاتے ہیں۔ تنگ آکر ہندو اپنے دل کو ڈھارس دے دیتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمان پسماندہ ہیں۔ مذہب زدہ ہیں۔ مذہب زدہ ہیں جنونی ہیں۔ شخص پرست ہیں اس لئے وہ دلائل کو سننا پسند نہیں کرتے۔ حالانکہ بغور دیکھا جائے تو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو قوم پرست بھی سیاسی طور پر ایک ناخواندہ مسلمان سے کم پسماندہ، کم مذہب زدہ، کم جنونی اور کم شخص پرست نہیں۔ ہم نے سیاسی معاملات میں اچھے اچھے ہندو پروفیسروں، وکیلوں اور ڈاکٹروں کو بھی بہت متعصب دیکھا ہے۔ وہ گاندھی جی کی اسی طرح پوجا کرتے ہیں کہ مسلمان نعوذ باللہ خدا کی بھی پرستش نہیں کرتے۔

ہندو اصلیت کو جاننا نہیں چاہتے۔ انہوں نے فیصلہ کر رکھا ہے کہ وہ ہندوستان کی سیاسیات کے بارے میں راستی پر ہیں۔ گاندھی جی کا فلسفہ حیات درست ہے۔ کانگریس کا پروگرام صحیح ہے۔ اس کے خلاف وہ تحقیقات کرنے کے لئے ہرگز تیار ہی نہیں ہوتے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ ان کے تمام نظریے غلط ثابت ہو رہے ہیں۔ واقعات ان کے خلاف ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ مسلم لیگ اور مسٹر جناح ہر دلعزیز ہوجائیں۔ لیکن پھر بھی ایسا ہو رہا ہے۔ یہ دیکھنے پر بھی وہ تیار نہیں کہ اپنے نظریوں کو بدل ڈالیں۔ اپنی طے شدہ باتوں پر خط تنسیخ پھیر کر ان کی جگہ نئی باتوں کو اپنائیں۔ چہ جائیکہ ان کے اس رویہ نے ہندوستان کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔

اس کا علاج کیا ہے؟ ہم مسٹر جناح کے پالیٹکس کو درست نہیں سمجھتے۔ ہم مسلم لیگ

کے نظریے کو غلط مانتے ہیں۔ ہماری رائے ہے کہ ہندوستان ایک ہے۔ یہاں کے جمہور ایک ہیں ان کے اقتصادی اور سیاسی مسائل ایک ہیں۔ لیکن اس حقیقت کو کس طرح نظرانداز کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کو کانگریس پر بھروسہ نہیں۔ وہ ہندوستان کی قوم پرست تحریک کو سچی قوم پرست تحریک نہیں مانتے اور جیسا کہ ہم نے اوپر بتایا اس کے لئے ان کے پاس ٹھوس دلائل موجود ہیں۔ اس لئے ہمیں چاہیے کہ ہم مسلمانوں پر برس پڑنے کے بدلے کانگریس کے موجودہ پروگرام اور سیاسی نظریوں پر نظر ثانی کریں۔ اسی بات کے پیش نظریہ ضروری ہے کہ اگر ہم "جناحیت" کو ختم کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں سب سے پہلے گاندھیت کو ختم کرنا چاہیے۔ گاندھیت اور جناحیت ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ اول الذکر موخر الذکر کو پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے۔ ہندو قوم پرست گاندھیت کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ اس کی پرورش کرتے ہیں۔ اس کو پوجتے ہیں۔ اور پھر یہ امید کرتے ہیں کہ جناحیت کو نابود کردیں گے۔ یہ ناممکن ہے۔

ع ایں خیال است محال است و جنوں!

جناحیت ختم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم پہلے اپنے میں یہ ہمت پیدا کریں کہ گاندھیت کو اڑا دیں۔ وہ لوگ جو گاندھیت کی حمایت کرتے ہیں وہ بالواسطہ جناحیت کو بھی فروغ دے رہے ہیں۔ اگر ہم آنکھیں بند نہ کریں تو دیکھ سکتے ہیں کہ اس وقت ایسا ہی ہو رہا ہے۔

ہندو قوم پرست جتنا زور گاندھیت کے زندہ رہنے اور پھلنے پھولنے پر دے رہے ہیں اتنا ہی فروغ جناحیت یعنی پاکستانی خیال کو حاصل ہو رہا ہے' اور جب ہندو قوم پرست اپنے اعمال کے نتیجہ کے طور پر یہ دیکھ پاتے ہیں تو افسوس کرنا شروع کردیتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں دیکھ سکتے کہ قصور ان کا اپنا ہے۔

ع ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا!

ہمارا نعرہ ہونا چاہیے۔ "جناح ازم کو مٹانے کے لئے گاندھی ازم کا مٹانا ضروری ہے۔" اسی سے ہندوستان آزاد ہو سکتا ہے۔ ہندو مسلم اتحاد ہو سکتا ہے اور ہمارا وطن غلامی سے نجات پاسکتا ہے۔

گاندھی ازم نے ہندوؤں کے اندر ایک خاص بیداری پیدا کی۔ ان کے دلوں میں دیش

اور جاتی کے لئے محبت پیدا کی۔ ان باتوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن گاندھیت نے ہندوستان کو کوئی سیاسی تربیت نہیں دی۔ انہیں اقتصادیات کے مسائل سے واقف نہیں کرایا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج بیس سال کی جدوجہد کے باوجود ہندوستان سیاسی طور پر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکا ہے۔ لوگ آج بھی ان ہی تعصبات کا شکار ہورہے ہیں۔ جن کا اس وقت تھے جب کہ گاندھی جی نے رہنمائی کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں نہیں لی تھی۔

اگر ہندوستان کو آزاد ہونا ہے تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے۔ وہ یہ کہ عوام کو سیاسی طور پر بیدار کر دیا جائے۔ انہیں بتایا جائے ان کے اقتصادی مسائل کیا ہیں اور ان کا حل کیا ہے۔ گاندھی ازم ایسا کرنے سے قاصر رہا ہے۔ گاندھی جی کے پاس ایک ہی ہتھیار ہے۔ اور وہ مذہب ہے جس کو استعمال کر کے آج تک انہوں نے لوگوں کو ابھارا ہے۔ لیکن مذہب اقتصادی مسائل کو حل نہیں کرسکتا۔ ہمیں چاہیے کہ ہم نوجوان ہندوستانیوں کو اقتصادی مسائل سے واقف کرائیں ۔ پھر نہ کہیں گاندھیت رہے گی نہ جناحیت‘ نہ ہندو مسلم جھگڑا دکھائی دے گا نہ پاکستان کا مطالبہ ہوگا۔ نہ اکھنڈ ہندوستان کا نعرہ بلند کیا جائے گا۔

(۲۷ جون ۱۹۴۳ء)

سیاسیات اور مذہب

ہم اس قوم پرستی کو صحیح قوم پرستی تسلیم کرنے سے انکار کرتے آئے ہیں جس میں سیاسیات اور مذہب کو خلط ملط کیا جاتا ہے۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس بات کی وضاحت کی جانی چاہیے کہ مذہب اور سیاسیات کا خلط ملط کرنا کیا ہے۔ کیونکہ ہمیں ایسا محسوس ہو رہا ہے۔ کہ اگر اس بات کی وضاحت نہ کی جائے تو بالکل ممکن ہے کہ غرض پرست لوگ عوام کو گمراہ کریں۔ اور انہیں بتائیں کہ ہم مذہب کے شدید ترین مخالف ہیں۔ اور اس کو مٹانے کے درپے ہیں۔ اسی لئے بار بار بتاتے رہتے ہیں کہ سیاسیات کو مذہب کے ساتھ خلط ملط نہ کرنا چاہیے۔

یہ جاننے کے لئے کہ مذہب اور سیاسیات کو کیسے خلط ملط کیا جاتا ہے ہمیں سمجھنا چاہیے کہ مذہب کیا ہے؟ اور سیاسیات کیا ہے؟ اس بات پر سب لوگ متفق ہیں کہ مذہب کا تعلق ہمارے عقبی کے ساتھ ہے۔ ہماری روحانی زندگی کے ساتھ ہے۔ اور سیاسیات کا تعلق ہماری دنیاوی اور سماجی باتوں کے ساتھ ہے۔ جمہور کے مذاہب الگ الگ ہوسکتے ہیں۔ کیونکہ خدا اور عقبی کی نسبت ہمارے خیال میں اختلاف ہے۔ لیکن ان کی سیاسیات علیحدہ علیحدہ نہیں ہوسکتی۔

عقبی چونکہ غائبانہ باتوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے ان کا انحصار زیادہ تر انسان کے اعتقادات پر ہے۔ لیکن دنیاوی اور سماجی باتوں کا تعلق اعتقاد پر نہیں اقتصادی اصولوں پر ہے۔ آپ نے کسی آدمی کو آج تک ایک دکاندار سے ایک سیر نمک کے بدلے ایک پاؤ نمک نہیں لیتے دیکھا باوجود اس کے کہ دکاندار ہزار بار اس کو یقین دلادے کہ بھروسہ کرو کہ یہ پاؤ بھر نمک ہی سیر بھر کے برابر کام دے گی۔ لیکن ہم نے اچھے بھلے آدمیوں کو مسجدوں۔ مندروں اور گوردواروں میں کئی ناقابل یقین باتوں پر پورا بھروسہ کرتے دیکھا۔ کیونکہ انہیں بتایا گیا کہ اگر وہ اس پر بھروسہ کریں گے تو فائدہ اٹھائیں گے۔ مثلاً کئی لوگ (کیا ہندو کیا مسلمان اور کیا سکھ) بڑی بڑی بیماریوں کے لئے باضابطہ علاج کرانے کے بدلے اپنے مذہبی پرچارکوں پیروں پروہتوں کے تعویذ یا گنڈے گلے میں ڈال کر بدپرہیزی کرتے ہیں۔ کیونکہ

ان کو بھروسہ ہے کہ یہ تعویذ ان کو تمام خطرات سے بچائیں گے۔ اس میں کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ بظاہر یہ عقل سے بعید نظر آتا ہے۔ لیکن مذہب والوں کو ایسی حرکات پر پورا بھروسہ ہے۔

ہم اس جگہ ان باتوں پر بحث نہیں کرنا چاہتے کہ مذہب والوں کا خدا اور غیبی طاقتوں پر اس قسم کا بھروسہ کرنا درست ہے یا نہیں۔ اور کیا فی الواقع کوئی غیبی طاقتیں ایسی موجود ہیں۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہر ایک مذہب میں غیبی قوتوں اور خاص کر خدا اور اس کی لاانتہا طاقت کو تسلیم کیا گیا ہے۔

ہم نے اوپر لکھا کہ دنیاوی اور سماجی باتوں میں کوئی آدمی غیبی باتوں پر بھروسہ کرکے بغیر دلیل کے عمل نہیں کرتا بلکہ ادنی سے ادنی عقل کا آدمی بھی خوب جانچ پڑتال کرنے کے بعد کاروبار کرتا ہے۔ مہذب انسانوں کا یہی طریقہ ہے اور ایسا ہونا بھی چاہیے۔ دنیاوی اور سماجی باتوں کو سیاسیات کہتے ہیں۔ عقبی کی باتوں کو مذہب کے نام سے پکارتے ہیں۔ دونوں کا طریق عمل جدا جدا اور ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ لیکن جب سیاسیات کو مذہب کے ساتھ خلط ملط کیا جاتا ہے تو سیاسیات میں بھی اعتقاد پرستی شروع ہوجاتی ہے۔ یہاں بھی دلیل اور منطق کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ اور اس کی جگہ اندھا وشواس ۔ یقین اور بھروسہ لے لیتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اچھے بھلے لوگ ایسی بحثیں کرتے ہیں جن کو دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے۔

ہندوستان میں گاندھی جی نے مذہب کو سیاسیات کے ساتھ خلط ملط کردیا۔ اس کی بدولت ہندوستانیوں نے دنیاوی اور سماجی معاملات کے متعلق سوچنا چھوڑ دیا۔ اور ہر ایک مسئلے کی نسبت یہی خیال کرنا شروع کردیا کہ اس کا حل پرماتما کسی نہ کسی طرح کرے گا۔ گاندھی جی نے ہندوستانیوں کو بار بار پڑھایا کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ پرماتما ہی کرتا ہے۔ ایک پتا بھی نہیں ہل سکتا۔ اگر بھگوان کی مرضی نہ ہو۔ اس لئے پرماتما پر بھروسہ کرو۔ اچھے برے پر توکل کرو۔ بس سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔ ہم اس بات پر بحث نہیں کرنا چاہتے کہ یہ صحیح ہے یا غلط کہ بھگوان کی مرضی کے بغیر پتا بھی نہیں ہل سکتا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جب ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں کبھی اس قسم کی باتوں کو آنے نہیں دیتے۔ ہم روٹی کھانے سے قبل جانتے ہیں کہ ہمیں ہاتھ صاف کرنا چاہئیں۔ تھالی سامنے لانی چاہیے۔ پھر بھوجن کو

منہ میں ڈالنا چاہیے۔ چبانا چاہیے اور اس طرح کرنے کے بغیر کبھی روٹی کھانے کا مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ تو بڑے بڑے سیاسی مسائل کی نسبت کیوں کسی غیبی طاقت کے حوالے یہ کام کیا جائے۔ اور اسی کو ان کے حل کا ذریعہ مانا جائے۔ ہم کیوں نہ ان مسائل کو بھی عام باتوں کی طرح کسی دلیل اور منطق کے مطابق حل ہونے والے سمجھیں۔

دراصل حقیقت یہ ہے کہ مذہب اور سیاسیات کو غلط ملط کرنے سے سرمایہ داروں کو لاانتہا فائدہ پہنچتا ہے۔ اس لئے جو لوگ جمہور کے حقیقی نمائندہ نہیں ان کا فلسفہ حیات کبھی انہیں اجازت نہیں دیتا کہ مذہب کو سیاسیات سے علیحدہ کردیا جائے۔ ان کے خلط ملط کرنے سے کس طرح سرمایہ داروں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ وہ بھی سنیئے۔ ایک کارخانے میں مزدور کام کر رہا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ کارخانہ کا مالک سرمایہ دار اس مزدور کی مزدوری کی بدولت پیسہ کماتا ہے۔ اگر مزدور کام نہ کرے سرمایہ دار کوئی روپیہ کما نہیں سکتا۔ اگر سیاسیات کی بنیاد خالص اقتصادیات پر ہو۔ یعنی اگر مزدور سمجھ لے کہ اقتصادی قوانین ہی سب کچھ ہیں تو وہ جھٹ جان لے گا کہ وہی دولت کو پیدا کرنے والا ہے سرمایہ دار نہیں۔ اس لئے جلد ہی وہ سماج کے اس قانون کے خلاف بغاوت کرے گا جس کے ہوتے ہوئے وہ اپنی محنت و مشقت کا پورا پھل نہیں پاتا۔ اور سرمایہ دار اس کی محنت کے پھل کا بیشتر حصہ ہڑپ کر جاتا ہے۔ لیکن اگر سیاسیات کے ساتھ مذہب بھی ہو تو مزدور حقائق کو سمجھنے اور اصلیت جاننے سے باز رکھا جاسکتا ہے۔ اس کو بتایا جاسکتا ہے کہ یہ صحیح ہے کہ تم کارخانے میں کام کرتے ہو۔ روپیہ پیدا کرتے ہو۔ لیکن اس دنیا کی' کارخانے کی' سرمایہ دار کی اور تمہاری بنانے والی کوئی غیبی طاقت ہے۔ جس کو خدا کہتے ہیں وہی چاہتا ہے کہ سرمایہ دار کی یہ حالت ہو۔ اور تمہاری یہ۔ اس لئے عقل' دلیل اور منطق کو چھوڑ دو۔ یہاں یہ کام نہیں آسکتیں۔ خدا پر یقین رکھو۔ مذہب پر بھروسہ کرو اور اپنا کام جاری رکھو۔ جب اس کو پروپیگنڈا کے ذریعہ اس طرح گمراہ کردیا گیا تو سرمایہ دار چین کی زندگی بسر کرتا رہے گا۔

پس جو لوگ سیاسیات کو مذہب کے ساتھ خلط ملط کرتے ہیں وہ مزدوروں کے دشمن ہیں۔ غریب لوگوں کے دشمن ہیں۔ اور سرمایہ داروں کے ایجنٹ ہیں۔ ان کا فلسفہ حیات سرمایہ داروں کو فائدہ پہنچا سکتا ہے جمہور کو نہیں۔

ہر ایک آدمی کا حق ہے کہ خدا۔ عقبیٰ۔ آخرت اور مذہب کی نسبت اپنے اپنے خیالات

رکھے۔ ان پر پورا یقین کرے۔ ان کا مکمل طور پر معتقد رہے۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ ان اعتقادات کو سیاسیات کے ساتھ خلط ملط نہ کرے۔ سیاسیات کے ساتھ عقبی کی باتوں کا کوئی واسطہ نہیں۔ جس طرح ہم اس آدمی کو دانش مند اور دوست جانتے ہیں۔ جو چاہے کتنا ہی عقیدت مند اور خدا پرست بزرگ کیوں نہ ہو۔ لیکن بیماری کے وقت ڈاکٹر سے مشورہ لیتا رہے۔ دوائی پیتا رہے۔ پرہیز کرتا رہے۔ اسی طرح سیاسیات میں بھی ہمیں اس کو سمجھدار اور عقلمند کہنا چاہیے۔ جو دنیاوی اور سماجی باتوں کے بارے میں اقتصادی قوانین کو مدنظر رکھے۔ مذہب کو دخل نہ دینے دے۔ یاد رکھیے کہ جوں ہی کوئی شخص سیاسی مسائل پر بحث کرتے وقت مذہبی باتوں کو لاتا ہے سمجھ لینا چاہیے کہ وہ سرمایہ داروں کا دانستہ طور پر یا نادانستہ طور پر ایجنٹ یا گماشتہ ہے۔ اور مزدوروں کے مفاد کے ساتھ دشمنی کرتا ہے۔ ہمارا وطن۔ (ہندوستان) تب ہی آزاد ہو سکتا ہے جب ترکی کی طرح یہاں بھی مذہب اور سیاسیات کو علیحدہ علیحدہ کردیا جائے۔ ترکوں نے اسلام کو خیرباد نہیں کہا۔ وہ اب بھی پکے اور راسخ العقیدہ مسلمان ہیں۔ انہیں اپنے مذہب پر پورا بھروسہ ہے شاید اس سے زیادہ جتنا ہندوستان کے مسلمانوں کو ہے۔ لیکن وہ دنیاوی اور سماجی باتوں میں مذہب کو دخل دینے نہیں دیتے۔ کسی سیاسی سوال کو حل کرتے وقت وہ نہیں کہا کرتے کہ جب تک ہمیں اندر سے آواز نہ آئے ہم اس کو حل نہیں کرسکتے۔ یا وہ ملکی اور قومی باتوں پر گفتگو کرنے سے قبل نہ نماز ادا کرنا ضروری سمجھتے ہیں نہ نعت خوانی کرتے ہیں۔ ترکی پارلیمنٹ کا کام قرآن شریف کی آیات کو پڑھنے کے بعد شروع نہیں کیا جاتا۔ مذہب ہر ایک ترک کو پیارا ہے۔ لیکن وہ جانتا ہے کہ اس کا تعلق اس کی ذات اور اس کے خدا اور عقبی کے ساتھ ہے۔ سیاسیات کے ساتھ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ترکی جو آج سے صرف پچیس سال قبل بہت ہی پس ماندہ تھا مذہب زدہ تھا۔ آج ترقی یافتہ ہے اور یورپ کے دیگر مہذب ممالک کے ساتھ ساتھ آگے قدم بڑھا رہا ہے۔

ہندوستان کے ہندو اور مسلمان اس حقیقت کو نہیں جانتے۔ مسلمان کھلم کھلا مذہب کو سیاسیات کے ساتھ خلط ملط کرتے ہیں۔ ہندو مسلمانوں کو پسماندگی کا طعنہ دیتے ہیں۔ لیکن خود مسلمانوں سے زیادہ مذہب زدہ ہیں۔ گاندھی جی کی تعلیم نے ان کی اس مذہب زدگی میں اور اضافہ کردیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم غلام ہیں اور نہ معلوم کب تک غلام بنے رہیں گے؟

(۸ جولائی ۱۹۴۳ء)

ہندو قوم پرستوں کی مہلک خود فریبی

آج کل ہندوستان میں ترکی کے اخبار نویسوں کا ایک وفد دورہ کر رہا ہے۔ جس شہر میں یہ وفد پہنچتا ہے۔ ہندوستانی اخبار نویس قدرتاً" ان سے ملاقات کر کے تبادلہ خیالات کرتے ہیں۔ بڑے بڑے شہروں میں پریس کانفرنسیں بھی ہوئیں جن میں کئی سیاسی اور بین الاقوامی مسائل پر وفد سے سوالات کئے گئے۔

عام طور پر ترک اخبار نویسوں نے ہندوستان کے خانگی مسائل کی نسبت ہر جگہ بحث و مباحثہ سے انکار کیا۔ چاہیے بھی ایسا ہی تھا۔ کیونکہ وہ اس ملک میں وزیٹر یا مہمان کی حیثیت سے آئے۔ اور خود جاننا چاہتے ہیں کہ ہندوستان کی سیاسیات کیا ہیں؟ اور اس ملک کی مجلسی اور اقتصادی حالت کیا ہے؟ پھر وہ کس طرح ان معاملات پر رائے زنی کر سکتے۔ لیکن پھر بھی وفد کے لیڈر آقائے عطائی نے کئی ایسی اہم باتیں کہی ہیں جن پر غور کرنا ہر ایک محب وطن ہندوستانی کا فرض ہے۔ ہم اس وقت ان تمام باتوں پر بحث کرنا نہیں چاہتے۔ جو حضرت عطائی نے اپنے پریس انٹرویو میں ہندوستانی اخبار نویسوں کو کہیں اور جن کا تعلق بالواسطہ یا بلا واسطہ ہندوستان کے خانگی مسائل کے ساتھ ہے ہم صرف ایک اہم بات کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں جو ہماری رائے میں ہندوستانی سیاسیات میں تمام الجھنیں پیدا کرتی ہے۔ اور ہندوستان کو آزادی کے نصب العین کی طرف بڑھنے نہیں دیتی۔ وہ ہے مذہب اور سیاسیات کو خلط ملط کرنے کا مسئلہ۔ جناب عطائی نے اپنی کئی ملاقاتوں کے دوران میں جو کچھ اس بارے میں فرمایا اس کا ملخص یہ تھا:-

"ترکی میں مذہب کو سیاسیات سے علیحدہ کر دیا گیا ہے۔ وہاں سیاسیات کی بنیاد اقتصادیات پر ہے۔ ہم قرآن شریف کی وہ تعبیر نہیں کرتے جو پہلے کی جایا کرتی تھی۔ اگر کوئی مولوی آج کل بھی وہی پرانی تعبیر کرنا چاہے تو اس کی وہاں کوئی نہ سنے گا۔ ترکی میں مذہب انسان کی ذاتی ملک ہے۔ حکومت کے معاملات میں اس کا کوئی دخل نہیں۔ زندگی کی جدوجہد میں ہم کبھی پیچھے کی طرف نہیں دیکھتے۔

ہمیشہ مستقبل پر نظر رکھتے ہیں---"

ترک وفد کی نسبت ان رپورٹوں کا شائع ہونا تھا کہ ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک "قوم پرست" پریس نے (جو تمام کا تمام ہندوؤں کی ملکیت ہے) ہندوستانی مسلمانوں پر لعنت و ملامت کی بوچھاڑ شروع کردی اور اس کا زیادہ حصہ مسلم لیگ پر برسایا ہر طرف یہ بتایا جانے لگا۔ دیکھو ترک اخبار نویسوں نے یہ سب کچھ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے کہا ہے۔ اپنے تاثرات میں حضرت عطائی نے ان کو ملامت کی ہے کہ ترک بھی مسلمان ہیں بلکہ ہندوستانی مسلمانوں سے زیادہ پکے مسلمان ہیں' لیکن وہ اپنی سیاسیات کو مذہب کے ساتھ خلط ملط نہیں ہونے دیتے۔ بلکہ ان کو علیحدہ علیحدہ رکھتے ہیں۔ اسی لئے وہ ترقی کر رہے ہیں۔ ہندوستانی مسلمان بہت پسماندہ ہیں۔ اسی لئے وہ اپنی سیاسیات کو مذہب کے ساتھ خلط ملط کر رہے ہیں۔ ان کے رہنما انہیں صحیح راستہ نہیں دکھا رہے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ ہندوستان کا کوئی ہندو اخبار اٹھا کر پڑھئے۔ چاہے وہ مہا سبھائی پالیسی کا پیرو ہے یا کانگریسی۔ آپ اس میں آج کل یہی باتیں دھرائی ہوئی دیکھیں گے۔

دیکھنا یہ ہے کہ کیا ہندو قوم پرست پریس کی یہ تنقید صحیح ہے۔ کیا اس میں سچائی سے کام لیا گیا ہے؟ ہم اس تنقید کو صحیح مانتے ہیں لیکن نامکمل ۔ ہماری رائے میں یہ تصویر کا ایک ہی رخ ہے۔ اور اگر تصویر کے صرف ایک ہی رخ کو دکھانا سچائی نہیں۔ تو یہ بھی سچائی نہیں۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ تصویر کے دوسرے رخ کو پیش کریں

ہمیں اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں کوئی انکار نہیں کہ ہندوستان کے مسلمان مذہب کو سیاسیات کے ساتھ خلط ملط کرتے رہے ہیں۔ اور یہ نہ تو ان کے اپنے لئے ٹھیک ہے' نہ مجموعی طور پر تمام ملک کے لئے فائدہ مند ہو سکتا ہے۔ ہندوستان کے مسلمان اگر اپنے غیر ہندوستانی ہم مذہبوں کی طرح ترقی نہیں کرتے تو اس کا بڑا سبب یہی ہے کہ وہ مذہب اور سیاسیات کو خلط ملط کرنے کی وجہ سے آگے قدم نہیں بڑھا سکتے۔ اور مسلم جمہور جہالت اور لاعلمی کا شکار بنے ہوئے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا صرف ہندوستان کے مسلمان ہی مذہب کو سیاسیات کے ساتھ خلط ملط کرتے ہیں۔ یا دوسرے فرقے اور خاص کر ہندو بھی کرتے ہیں؟ اس سوال کا جواب ہمارے ہندو قوم پرست دوست اور خاص کر کانگریسی جھٹ دے دیں گے کہ "جہاں تک مہا سبھائی ہندوؤں کا تعلق ہے وہ تو بلاشبہ سیاسیات اور مذہب

کو خلط ملط کرتے ہیں۔ لیکن جہاں تک کانگریس کا تعلق ہے یہ تو ایک خالص سیاسی جماعت ہے۔ ہر کوئی ہندوستانی اس کا ممبر بن سکتا ہے اور اپنے وطن کی آزادی کے لئے لڑ سکتا ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ ہندوؤں کی اکثریت کانگریس کے ساتھ ہے مہا سبھا کے ساتھ نہیں۔ اس لئے ثابت ہوا کہ ہندو سیاسیات کو مذہب کے ساتھ خلط ملط نہیں کرتے۔ اس کے عوض مسلمانوں کو دیکھئے۔ گو کہنے کو ہم کہتے ہیں کہ مسلم لیگ اور مسٹر جناح کے ساتھ ہندوستانی مسلمان نہیں۔ لیکن حقیقت سے انکار کرنا غلط ہے ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت نہ تو آزاد مسلم کانفرنس کے ساتھ ہے نہ احرار یا جمعیت العلماء کے ساتھ اور نہ مومنوں کے ساتھ وہ تو مسلم لیگ کے ساتھ ہے اور یہ انجمن اعلانیہ مذہب اور سیاسیات کو آپس میں خلط ملط کرتی ہے۔ لہٰذا ہندوستانی مسلمانوں کی نسبت یہ کہنا کہ وہ مذہب اور سیاسیات کو خلط ملط کرتے ہیں بالکل صحیح ہے۔"

ہم سمجھتے ہیں کہ ہندو قوم پرستوں کی یہ دلیل سطحی ہے اور اس کو پیدا کرنے کی ذمہ داری قوم پرست پریس اور ہندو قوم پرست لیڈروں کی ہے جو اپنے مضامین اور تقریروں میں تصویر کا ایک ہی رخ پیش کرتے رہتے ہیں اور ملک کے اندر اس قسم کی خطرناک ذہنیت پیدا کرتے ہیں۔ جو یک طرفہ دیکھنے کی عادی بن گئی ہے۔

پھر حقیقت کیا ہے؟ اس کو سمجھنے کے لئے ذرا زیادہ غور و فکر کی ضرورت ہے۔ ہمیں دیکھنا ہے کہ سیاسیات کس کو کہتے ہیں؟ اور مذہب کس چیز کا نام ہے؟ یہ جاننے کے بعد ہی ہم فیصلہ کرسکتے ہیں کہ کیا ہندو بھی ان دونوں کو خلط ملط کرتے ہیں۔ یا علیحدہ علیحدہ رکھتے ہیں۔

انسان ایک سماجی حیوان ہے۔ یعنی وہ سماج کے فرد کی حیثیت سے زندگی بسر کرتا ہے۔ اور ترقی کرسکتا ہے۔ ورنہ نہیں۔ اس کو زندہ رکھنے کے لیے ضروریات زندگی مہیا کرنے پڑتے ہیں۔ وہ ان ضروریات کو سماج کے دوسرے افراد کے ساتھ مل کر ہی پیدا کرتا ہے۔ اس لئے اس کو دوسرے انسانوں کے ساتھ تعلقات پیدا کرنے پڑتے ہیں۔ یہ تعلقات وقتاً فوقتاً بدلتے رہتے ہیں ان کو بدلنا۔ ان میں ترمیم کرنا۔ اس کو سیاسیات کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کی بنیاد اقتصادیات ہے۔ کیونکہ یہ تعلقات ضروریات زندگی کو پیدا کرنے کے لئے بنائے جاتے ہیں۔ اور ضروریات زندگی کا مسئلہ اقتصادی ہے۔

انسانی سماج کی ابتداء میں جب کہ سائنس کا جنم نہ ہوا تھا انسان یہ نہ جانتا تھا کہ یہ دنیا کس طرح بنی ہے۔ ہم کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جائیں گے؟ دنیا کا کاروبار کس طرح چل رہا ہے؟ اس لئے اس کو یقین تھا کہ اس سب کی پشت پر کوئی غیبی اور پراسرار طاقت کام کر رہی ہے۔ ہم اس کے آلہ کار ہیں۔ اس سے زیادہ نہیں۔ ابتدائی انسان یعنی وحشی کو جب کوئی مشکل پیش آتی تھی تو وہ بے بس بن کر اس غیبی طاقت یعنی خدا کی پرستش کرنے لگ جاتا تھا۔ اور سمجھتا تھا کہ جس طرح انسان کو تعریف کرنے سے خوش کیا جاسکتا ہے اسی طرح خدا کو بھی پرارتھنا یا حمد و ثنا کے ذریعہ خوش کیا جاسکتا ہے۔ اسی کا نام مذہب ہے۔

قدرتی طور پر انسانی سماج کے ابتدائی حصے میں اور زمانہ وسطی میں سیاسیات پر مذہب کا بڑا اثر تھا۔ کیونکہ انسان سمجھتا تھا کہ اس کی حرکت اور کام کرانے والا وہی غیبی طاقت یعنی خدا ہے۔ لیکن گذشتہ چار صدیوں میں سائنس نے بڑی ترقی کی۔ اور جن چیزوں کو انسان سمجھ نہ سکتا تھا وہ بہت کچھ حل ہوگئیں۔ سائنس نے بے شمار گرہ کو کھول کر رکھ دیا۔ اور دکھا دیا کہ انسان کی آزادی کی کوئی حد نہیں۔ وہ اپنے مستقبل کو بنا اور بگاڑ سکتا ہے۔ یعنی وہ اس غیبی طاقت کے اثر سے آزاد ہے۔ یا کم از کم اس حد تک غلام نہیں جیسا کہ وہ سمجھتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیاسیات کو مذہب سے علیحدہ کردیا گیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ مذہب کی نسبت پرانے خیالات کو دفنایا جاتا۔ لیکن چونکہ ایسا کرنا آسان نہ تھا۔ اس لئے مذہب پرستوں کی مخالفت کو کم کرنے کے لئے یہ فیصلہ ہوا کہ مذہب کو سیاسیات سے علیحدہ کردیا جائے۔ تاکہ جو لوگ پھر بھی غیبی طاقت ۔ الہام۔ پرارتھنا اور اسی قسم کی باتوں پر بھروسہ رکھتے ہوں وہ اپنا کام کرتے رہیں۔ لیکن سیاسیات میں ان کا کوئی دخل نہ ہو۔ اور سیاسیات کی بنیاد خالص اقتصادیات ہو۔ جو علم سائنس کی ایجادات کے مطابق چلائی جاسکے۔ پس ہم دیکھ سکتے ہیں کہ دنیا میں تین نظریے ہیں۔ اول یہ کہ سیاسیات کو مذہب کے ساتھ خلط ملط کردیا جائے۔ سیاسیات کچھ بھی نہیں۔ اگر اس کی بنیاد مذہب پر نہیں۔ یہ نظریہ انسانی سماج کے ابتدائی حصہ اور زمانہ وسطی کا ہے جب کہ انسان جاہل اور لاعلم تھا اور اپنے ماحول کو سمجھ نہ سکتا تھا اس کے بعد جب سائنس کی ایجادات نے انسان کی آنکھیں کھول دیں اور اس کو ترقی کے راستے دکھائے تو ترقی پسند حلقوں نے مذہب کو سیاسیات سے علیحدہ کردیا۔ یہ

سرمایہ دارانہ جمہوری دور کا نظریہ ہے سرمایہ داری کبھی ترقی نہیں کرتی۔ اگر ایسا نہ ہوتا ہم ابھی سرمایہ داری کے دور سے ہی گذر رہے ہیں۔ تیسرا نظریہ مذہب کو (مراد ابتدائی مذہب یعنی Primitive Religion) ختم کرنا ہے۔ وہ سوشلزم کا کام ہے جو غیبی طاقت کو بالکل نہیں مانتا۔ اور دنیاوی نظام کو ایک مشین کی طرح ایسے قانون سے جاری پاتا ہے جسے ہم سمجھ سکتے ہیں۔

ہندوستان کی طرح مشرق وسطیٰ کے عرب ممالک بھی گذشتہ جنگ عظیم سے قبل زمانہ وسطیٰ کے دور سے گذر رہے تھے جنگ عظیم نے ان ممالک میں سماجی اور سیاسی انقلاب پیدا کردیا۔ لیکن یہ انقلاب وہاں سوائے ترکی کے دوسرے ملکوں میں مکمل طور پر کامیاب نہ ہوا۔ ہم یہاں اس بات پر بحث نہیں کرنا چاہتے کہ دوسرے عرب ممالک میں یہ انقلاب کس حد تک نامکمل رہا۔ لیکن جہاں تک ترکی کا تعلق ہے وہاں یہ مکمل طور پر کامیاب ہوا۔ وہاں مذہب کو سیاسیات سے ہی علیحدہ نہ کیا گیا بلکہ مذہب کی تعبیر ہی سائنس کے اصولوں کے مطابق ہونے لگی۔ اور جہاں ایسا نہ ہوا وہاں مذہب کو تلانجلی دی گئی۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ اتاترک کی رہنمائی میں ترکوں نے اپنے ماضی کو بالکل خیرباد کہہ کر مستقبل کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ یہی باتیں مسٹر عطائی نے اپنی ملاقاتوں کے دوران میں بار بار دہرائی ہیں۔

متذکرہ صدر باتوں کو مدنظر رکھ کر وہ ہندو قوم پرست بہت ہی جرات مند ہوگا جو کہے گا کہ کانگریس میں مذہب اور سیاسیات کو علیحدہ علیحدہ رکھا جاتا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ ہندوستان کی کوئی سیاسی انجمن نہیں جس میں مذہب کو سیاسیات کے ساتھ اتنا خلط ملط کیا جاتا ہو جتنا کانگریس میں ۱۹۲۰ء سے پہلے یہ درست تھا کہ کانگریس خالص سیاسی جماعت تھی۔ اور اس میں مذہب کو سیاسیات کے ساتھ خلط ملط نہ کیا جاتا تھا۔ لیکن جب سے کانگریس پر گاندھی جی کا اثر پڑا اس میں مذہب اور سیاسیات ایک ہوگئے۔ گاندھی کی تمام تصانیف اور تقریریں اس حقیقت کی شہادت میں پیش کی جاسکتی ہیں۔ ان کی ایک ایک سطر اور ایک ایک لفظ۔ ان کی ایک ایک حرکت اور ان کا ایک ایک سانس مذہب اور سیاسیات کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا رہے ہیں اور وہ مذہب بھی کون سا؟ آج کل کی تعبیر والا نہیں۔ بلکہ ابتدائی انسان کا مذہب جس میں غیبی طاقت۔ الہام پرارتھنا اور معجزہ سب کچھ موجود ہیں۔ لیکن کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ ہندو قوم پرست یہ نہیں دیکھ سکتے۔ گاندھی جی نے ہندوستانی جمہور

کو بیدار کر کے بہت اچھا کام کیا۔ لیکن ہندوستانی سیاسیات میں مذہب کو گھسیٹ کر ہندوستان کو انقلاب کے راستے پر نہیں بلکہ تنزل کی راہ پر لگایا۔ مسٹر عطائی نے اپنی ملاقات میں جو کچھ کہا اس کا اشارہ اسی طرف تھا۔ لیکن ہندو قوم پرستوں نے جھٹ اس کو مسلمانوں کے سر تھوپ کر اپنے دل کو تسلی دی۔ کتنی مہلک خود فریبی ہے؟

ہندو قوم پرست دراصل ایک فاش غلطی میں مبتلا ہوگئے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ فرقہ پرستی اور مذہب ایک ہی بات ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ فرقہ پرستی مذہب پرستی کا ایک حصہ ہے۔ مذہب اس سے زیادہ وسیع چیز ہے۔ مذہب کے بنیادی اصول تصوف (Mysticism) اور الہیات (Metaphysics) ہیں جہاں ان چیزوں کا دخل ہوا۔ مذہب موجود ہے۔ گاندھی جی میں یہ دونوں چیزیں بدرجہ غایت موجود ہیں۔ اور موجودہ ہندوستانی قوم پرستی کچھ بھی نہیں۔ اگر اس کو گاندھیت سے علیحدہ کردیا جائے۔ ہندو قوم پرست سمجھتے ہیں کہ چونکہ گاندھی جی سیاسی تقریروں اور تحریروں میں کسی تسلیم شدہ مذہب کا نام نہیں لیتے۔ اس لئے ان کی سیاسیات میں مذہب کو دخل نہیں اور چونکہ مسٹر جناح اور دوسرے ہندو مسلمان لیڈر اپنی تقریروں اور تحریروں میں اپنے اپنے مذاہب کا نام لیتے ہیں۔ اس لئے ظاہر ہے کہ وہ سیاسیات اور مذہب کو خلط ملط کرتے ہیں۔ ایسا سمجھنا اپنی لاعلمی کا ثبوت دینا ہے۔ گاندھی جی کسی مذہب کا نام نہ لے کر بھی اپنے طرز عمل اور اپنے فلسفہ کی وجہ سے قدم قدم پر مذہب اور سیاسیات کو خلط ملط کرتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مسٹر محمد علی جناح فقہ پرست ہوتے ہوئے بھی اتنے مذہب پرست نہیں جتنے کہ گاندھی جی ہیں۔ یہ بات کچھ اچنبا معلوم ہوتی ہے۔ اور شاید ہندو قوم پرست کے لئے کڑوی بھی ہو۔ لیکن واقعات کی بناء پر سو فیصدی درست ہے۔

قریباً" تین سال کا عرصہ ہوا' جب ہم نے یہ بات پہلی دفعہ اس وقت بتائی تھی جب کشمیری قوم پرست ہندو کارکنوں نے شیخ محمد عبداللہ کے خلاف یہ الزام عائد کیا تھا کہ انہوں نے قوم پرست ہوتے ہوئے کیوں کہا کہ وہ پہلے بھی مسلمان اور آخر بھی مسلمان ہیں۔" ہم نے دوسرے قوم پرست ہندو کارکنوں کے ساتھ اتفاق کرتے ہوئے بتایا تھا کہ سچے قوم پرستوں اور ترقی پسندوں کی حیثیت سے ہمیں سیاسیات کو مذہب کے ساتھ خلط ملط نہ کرنا چاہیے اور مذہب کو اپنی ذاتی حیثیت تک محدود رکھنا چاہیے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم

نے کہہ دیا تھا کہ جو کچھ شیخ صاحب نے اعلان کیا گاندھی جی یہی ہر وقت کرتے رہے ہیں۔ شیخ صاحب کی قوم پرستی گاندھی جی کی قوم پرستی کے عین مطابق ہے۔ اس لئے ہندوؤں کو ان کے خلاف کوئی اعتراض نہ کرنا چاہیے۔ لیکن ہندو رفقاء نے حسب معمول اس خود فریبی کے زیر اثر ہماری باتوں پر ہنسی اڑائی۔ اور یقین کرتے رہے کہ نہ تو گاندھی جی اور نہ کانگریس ہی سیاسیات اور مذہب کو خلط ملط کرتے ہیں۔

مسٹر عطائی نے اپنی ایک ملاقات میں ایک خاص بات بتائی تھی۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیاسیات اور مذہب کی نسبت انہوں نے جو کچھ کہا اس میں ان کا اشارہ کانگریسی سیاسیات کی طرف ہے۔ اس بات کو ہندو قوم پرستوں نے بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ مسٹر عطائی نے کہا کہ ترکی کے لوگ زندگی کی جدوجہد میں اپنے ماضی کی طرف نہیں دیکھتے۔ بلکہ ہمیشہ مستقبل پر نظر رکھتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کبھی نہیں کہتے کہ ترک قوم نے اپنے ماضی میں شاندار ترقی کی تھی اور اب اس وقت تنزل میں پڑی ہوئی ہے۔ اس لئے انہیں پھر وہی زمانہ واپس لانا چاہیے۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر ترکی کے لوگوں کو حقیقی ترقی کے راستے پر گامزن رہنا ہے تو ان کو ماضی کی طرف نہیں مستقبل کی طرف دیکھنا چاہیے اور سائنس نے جو ترقی کا راستہ دکھایا ہے اس پر چلنا چاہیے۔

آج کل کی ہندوستانی قوم پرستی کا نصب العین اس کے بالکل برعکس ہے۔ جو لوگ مہاتما جی کے خیالات اور عقائد سے واقف ہیں یا جنہوں نے ان کی کتاب "ہند سوراجیہ" کا مطالعہ کیا ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ مہاتما جی مستقبل کی طرف دیکھنے کے عوض ماضی کی یاد تازہ کرتے رہتے ہیں۔ ان کے سوراجیہ کا بہترین منظر رام راجیہ ہے۔ وہ سائنس کو تباہی و بربادی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اور حق تو یہ ہے کہ ان کی تعلیم کے زیر اثر ہندوستان کی قوم پرستی رجعت پسندانہ بن چکی ہے اور ہر ایک ہندو یہی آس لگائے بیٹھا ہے کہ جب ہندوستان آزاد ہو گا تو اس ملک میں وہی راجندر جی کا زمانہ واپس آئے گا۔ بیل گاڑی ہو گی۔ ٹوٹی پھوٹی سڑکیں ہوں گی۔ گاڑھا اور کھدر پہننے کو ملے گا۔ اور بس۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ مسٹر عطائی نے اپنے ترقی پسند ملک کی حالت کا ذکر کرتے ہوئے دراصل اس ذہنیت کی مذمت کی۔ اور بتایا کہ یہ ترقی پروری نہیں" رجعت پسندی ہے لیکن اس کے باوجود ہندو قوم پرستوں نے اس ملاقات کو بھی اپنے ہی رنگ میں رنگ کر ہندوؤں کے اندر اس غلط یقین کو مضبوط کر دیا کہ

ہندو پیدائش سے قوم پرست ہیں اور مسلمان فرقہ پرست اور اب ترک اخبار نویسوں نے ان کی اس رائے پر اپنی مہر تصدیق ثبت کردی۔ ہم اس طریق کار کو مہلک خود فریبی سمجھتے ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ جب تک ہندو اس طریق کار کو خیرباد نہ کہیں گے ہندوستان آزاد نہیں ہو سکتا۔

ہندوستان کے مسلمان بھی اور ہندو بھی مذہب کو سیاسیات کے ساتھ خلط ملط کرتے ہیں۔ یہ ان کی پسماندگی کی علامت ہے۔ ہندوستان کے موجودہ مشہور اور مقبول عام لیڈر چاہے وہ ہندو ہیں یا مسلمان، ہندوستان کی اس پسماندگی کو ناجائز طریقے سے استعمال کرتے ہیں اور اس پر تجارت کر رہے ہیں۔ وقت آرہا ہے جب ہندوستان کے عوام ایسی قیادت کا خاتمہ کرکے ہی دم لیں گے ۔ کیونکہ اس کے بغیر ہندوستان میں وہ سماجی اور سیاسی انقلاب آہی نہیں سکتا جس کی اس وقت ہمارے وطن کو از حد ضرورت ہے اور جس کے بغیر اس ملک کے کروڑوں غریب فاقہ کش افلاس اور فلاکت سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔

(۲۱ فروری ۱۹۴۳ء)

پاکستان کا ذمہ دار کون؟

موجودہ ہندوستان کا سب سے بڑا سیاسی مسئلہ پاکستان ہے۔ پاکستان کی تحریک کا مدعا یہ ہے کہ ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کیا جائے۔ ایک وہ جہاں ہندو اکثریت میں آباد ہیں وہاں ہندوؤں کی حکومت ہو۔ اور دوسرا وہ جہاں مسلمان اکثریت میں آباد ہیں وہاں مسلمانوں کی حکومت ہو۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ہندو چاہے وہ فرقہ پرست ہوں یا قوم پرست اس تقسیم کے خلاف ہیں۔ ہم بھی اس تقسیم کے خلاف ہیں۔ لیکن ان وجوہات سے نہیں جن سے فرقہ پرست اور قوم پرست ہندو اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ آگے چل کر ہم ان وجوہات پر بحث کریں گے۔ جو ہمیں اس تقسیم کی مخالفت پر آمادہ کرتے ہیں مسلمان من حیث القوم اس تقسیم کو اپنی ترقی کے لئے اچھا سمجھتے ہیں۔ اس لئے ہندوستان کی موجودہ سیاسیات میں پاکستان کا مسئلہ بہت اہم بن چکا ہے۔ اتنا ہی اہم جتنا ہندو مسلم اتحاد کا سوال ہے۔ دراصل غور سے دیکھا جائے تو پاکستان کا مسئلہ ایک نئی شکل میں ہندو مسلم اتحاد کا وہی پرانا مسئلہ ہے۔ کیونکہ اگر ہم ہندو مسلم اتحاد کرانے میں کامیاب ثابت ہوئے ہوتے تو پاکستان کا مسئلہ پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا۔

پاکستان کا مسئلہ روز بروز اہم تر بھی بنتا جاتا ہے۔ اور زیادہ پیچیدہ بھی۔ جتنا اس کو حل کرنے کی کوششیں کی جاتی ہیں اتنا ہی یہ ناقابل حل بن رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستانی اپنے سیاسی مسائل کو سطحی طور پر دیکھنے کے عادی ہوگئے ہیں۔ وہ سطح کے نیچے دیکھنے کی تکلیف ہی نہیں اٹھاتے۔ ہمیں قومی مسائل کو گہری نگاہ سے دیکھنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ تاکہ مسئلے کی بنیادی حقیقت معلوم ہو۔ اور اس کی جڑ کو دریافت کرکے اس کا علاج کیا جاسکے۔ ہندو سمجھتے ہیں کہ پاکستان کا مسئلہ مسلم فرقہ پرستی کا پیدا کردہ ہے مسلمان تنگ نظر واقع ہوا ہے۔ اس کو ہندوستان کے ساتھ محبت نہیں۔ اس لئے وہ ہندوستان کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کرکے اپنا حصہ الگ نکالنا چاہتا ہے۔ چوں کہ ہندوؤں کا خیال ہے کہ ہندوستان پر

بلا شرکت غیرے ان کا حق ہے اس لئے وہ اس تقسیم کے خلاف ہیں۔ وہ یہ کہتے ہوئے اتنا بھی نہیں سوچ سکتے کہ ہندوستان پر بلا شرکت غیرے اپنا حق جمالینا بھی فرقہ پرستی ہے۔

اگر وہ کسی اور وجہ سے نہیں۔ صرف ہندوؤں کی اس مخالفت کی وجہ سے ہی مسلمان پاکستان کو اپنے لئے بہت اچھا سمجھتے ہیں۔ انہیں پورا یقین ہے کہ ہندو چاہے وہ مہا سبھائی ہوں یا کانگریسی بڑے تنگ نظر اور خود غرض واقع ہوئے ہیں۔ اس لئے اگر وہ پاکستان کی مخالفت کر رہے ہیں اس میں ان کی کوئی نہ کوئی غرض ہے۔ اور پاکستان میں مسلمانوں کا ضرور بھلا موجود ہے۔ وہ اس تحریک کی دل و جان سے حمایت کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان کے طول و عرض میں اس مسئلہ پر آج کل لے دے ہورہی ہے۔ شمالی ہند میں پاکستان اور خلاف پاکستان کانفرنسیں منعقد کی جارہی ہیں۔

ظاہر ہے کہ جب تک مسلمانوں اور ہندوؤں کی موجودہ ذہنیت برقرار رہے گی اس مسئلے کا حل ناممکن ہے۔ ہندو لاکھ چلائیں کہ وہ ہندوستان کو تقسیم نہ ہونے دیں گے وہ اس کو اکھنڈ رکھیں گے جب تک ہندوستان کے نو کروڑ مسلمان اس بات پر تلے ہوئے ہیں کہ وہ پاکستان لے کر رہیں گے ہندوؤں کا شور و غوغا بے معنی ہے۔ اسی طرح جب تک پاکستان میں آباد کروڑوں ہندو پاکستان کے خلاف ہیں مسلمان اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔ اس لئے ان حالات میں ہمارا ملک یا تو ہمیشہ کے لئے غلام رہے گا یا اس میں خانہ جنگی شروع ہوجائے گی جس کا انجام بتانا مشکل ہے۔ لیکن یہ دیکھنا مشکل نہیں کہ اس خانہ جنگی میں مبتلا ہوکر لاکھوں بے گناہ موت کے گھاٹ اتر آئیں گے۔ اور ملک میں خون کی ندیاں بہیں گی۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم خانہ جنگی کے بغیر ہی آزادی حاصل کرسکیں۔ ہماری رائے میں یہ ممکن ہے لیکن اس کے لئے غور و فکر کی ضرورت ہے۔ غیر جانبدار طریقے سے اور بے تعصب ہوکر یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ پاکستان کا مسئلہ کہاں سے پیدا ہوا۔ اس تحریک کا کون ذمہ دار ہے؟

ہم نے اوپر بتلایا کہ پاکستان کی ذمہ داری مسلمانوں کی فرقہ پرستی پر ڈالی جارہی ہے۔ اس تحریک کا قائداعظم جناح کو تسلیم کیا جارہا ہے۔ ہندو سمجھتے ہیں کہ اگر سیاسیات میں جناح پیدا نہ ہوا ہوتا تو پاکستان کے خیال اور تحریک کو وہ تقویت حاصل نہ ہوئی ہوتی جو اس کو حاصل ہوئی ہے۔ اکثر مسلمانوں کی بھی یہی رائے ہے۔ لیکن ہم اس کو درست نہیں سمجھتے۔

ہماری رائے ہے کہ یہ حقیقت نہیں۔ یہ درست ہے کہ ہندوستانی سیاسیات کو سطحی طور پر دیکھنے سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ایک اتنی بڑی تحریک کو جس نے کروڑہا انسانوں کی سماجی اور سیاسی زندگی پر اثر ڈالا ہو سطحی طور پر دیکھنا بڑی غلطی ہے۔ یہ سمجھنا کہ پاکستان کی تحریک کو چلانے کا خیال ایک رات مسٹر جناح کے دماغ میں آیا۔ انہوں نے صبح اٹھ کر اس کا اعلان کردیا۔ اور پھر کروڑہا مسلمان ان کے پیچھے پیچھے ہوئے واقعات سے اغماض کر کے خود فریبی میں مبتلا ہونا ہے۔

پھر بھی سوال باقی رہتا ہے کہ اگر پاکستان کی تحریک کی ذمہ داری جناح اور مسلم فرقہ پرستی پر نہیں ڈالی جاسکتی۔ تو اس کی ذمہ داری کس پر ہے؟ ہماری رائے میں اس کی ذمہ داری ہمارے ملک کی سیاسیات کے ان بنیادی اصولوں پر ڈالی جانی چاہیے جن پر اس کو چلایا جارہا ہے۔ ہم نے بار بار لکھا کہ ہمارے ملک میں سیاسیات کو مذہب کے ساتھ خلط ملط کیا جاتا ہے۔ کانگریس ہماری سب سے بڑی سیاسی تنظیم ہے۔ یہ گاندھیت کے اصولوں پر کام کر رہی ہے۔ اور گاندھیت میں سیاسیات اور مذہب کو خلط ملط کیا جاتا ہے۔ جس سے فرقہ پرستی کے جراثیم پیدا ہوتے ہیں۔ اس حقیقت کے باوجود کہ کانگریس بار بار عوام سے کہتی رہی ہے کہ وہ ایک ہیں۔ ان کے اقتصادی اور سیاسی مسائل ایک ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی تفریق نہیں۔ کانگریس ان کے دلوں سے اس خیال کو نہ مٹا سکی کہ ہندو ہندو ہے اور مسلمان مسلمان۔ گاندھی جی نے ہندو مسلم اتحاد اپنی زندگی کے پروگرام کا ایک ناقابل فراموش جزو بنادیا ہے۔ ان کا دعوی ہے کہ وہ اس اتحاد کے لئے اپنی زندگی قربان کرنے کو تیار ہیں۔ پھر بھی یہ اتحاد نہیں ہوتا بلکہ ہندو مسلم ایک دوسرے سے روز بروز زیادہ ہی دور چلے جارہے ہیں۔ کیا ہندوستان کے عوام ایسے ہیں؟ کیا ان کی خصلت اتنی مکروہ اور قابل نفریں ہے کہ گاندھی جی جیسے ہمدرد کی اتنی عظیم الشان قربانی پر بھی ہندو مسلم آپس میں متحد نہیں ہوسکتے؟ ہماری رائے ہے کہ یہ بات نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ گاندھی جی کے وہ بنیادی اصول اور فلسفہ حیات ہی درست نہیں۔ جن پر کھڑے ہو کر وہ ہندو مسلم اتحاد کرانا چاہتے ہیں۔ اس لئے ہندو مسلم اتحاد کے دعووں اور نعروں کا نتیجہ الٹ نکل رہا ہے۔ گاندھی کانگریس کا سیاسی عقیدہ ہے - یہ مذہب کو سیاسیات سے جدا نہیں کرتا۔ گاندھی جی کے سامنے سیاسیات کو کوئی حیثیت ہی حاصل نہیں۔ اگر اس کی بنیاد مذہب پر نہ ہو۔ حق تو یہ

ہے کہ گاندھی جی کی بیس سالہ سیاسی دور دورے میں کانگریس کے اندر دو متوازی تحریکیں چلتی رہی ہیں۔ ایک سیاسی اور اقتصادی تحریک جس کی وجہ سے وہ پروگرام بنتے رہے۔ جو ہندوستانی عوام کے لئے مشترکہ ہیں۔ دوسری وہ مذہبی پرچار جس کا مقصد ہندو سماج کو بلند و برتر بنانا ہے۔ گاندھی جی اس دوسری تحریک سے زیادہ دلچسپی لیتے آئے ہیں۔ اس کی بدولت کانگریس کی سیاسی تحریک پر ہندو تحریک کا رنگ چڑھ گیا۔

مذہب اور سیاسیات کو خلط ملط کرنے سے یہ نتیجہ نکلا ہے کہ ہمارے ملک کے اندر جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے وہاں اس سیاسی تحریک نے ہندو تحریک کی شکل اختیار کی ہے اور جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں اس نے مسلم تحریک کی شکل اختیار کی ہے۔ یہ ہونا بھی لازمی تھا۔ کیونکہ اگر مذہب اور سیاسیات کو ساتھ ساتھ چلنا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس تحریک کے کامیاب ہونے پر ہندو اکثریت والے صوبوں میں کیوں ہندو حکومتیں قائم نہ ہوں۔ اور مسلم اکثریت والے صوبوں میں کیوں مسلم حکومتیں قائم نہ ہوں۔ گاندھیت کا لازمی نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا۔ اور یہی ہو بھی رہا ہے۔ خود گاندھی جی کو بھی اس کا اعتراف ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۴ء میں جب راقم الحروف نے ان سے ریاست کشمیر کی سیاسیات کے بارے میں رائے حاصل کی تھی تو انہوں نے اپنی چٹھی مورخہ ۱۵ مئی ۱۹۳۴ء میں صاف لکھا تھا کہ:۔

> اس بات کے پیش نظر کہ کشمیر کی کثیر آبادی مسلمانوں کی ہے یہ خطہ ایک نہ ایک دن لازمی طور پر مسلم ریاست بن جائے گا۔ اس واسطے ایک ہندو شہزادہ صرف اسی صورت میں اس پر حکمرانی کر سکتا ہے۔ جب وہ حکومت نہ کرے یعنی کہ مسلمانوں کو وہ سب کچھ کرنے کی اجازت دے جو وہ چاہیں اور اگر وہ صریح طور غلط راہ پر گامزن ہو جائیں تو ان کے حق میں دست بردار ہو جائے۔ ۱۱

اگر کشمیر کے لئے یہ کہا جا سکتا ہے تو صوبہ سرحد۔ سندھ اور بلوچستان کی نسبت بھی یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ بھی مسلم ریاستیں (حکومتیں) بن کر رہیں گی۔ اگر یہ پاکستان نہیں تو ہمیں بتلایا جائے کہ پاکستان کس کو کہتے ہیں؟ یہ صحیح ہے کہ جب گاندھیت کے اصولوں اور پرچار سے اس کے لازمی نتائج رونما ہونے لگے ہندو فرقہ پرست کے مقابلے میں مسلم فرقہ پرستی زوروں پر آئی۔ ہندو راجیہ کے مقابلے پر پاکستان کا خیال زور پکڑ گیا۔ اور اس تحریک نے اپنا قائد اعظم جناح پیدا کیا۔ تو ہندوؤں کو تو ڈرنا ہی تھا۔ خود گاندھی جی بھی خوفزدہ ہو گئے جنہوں

نے متذکرہ صدر چٹھی میں خود ہی پاکستان کے اصول کا اعتراف کیا تھا۔ لیکن اس سے کیا ہوسکتا ہے؟ جو بیج بویا گیا اس کا پھل مل رہا ہے۔ تعجب یہ نہیں بلکہ تعجب یہ ہے کہ ہندو عموماً" اور گاندھی پرست خصوصاً" اس پھل یا نتیجے کو برا کہتے ہیں۔ لیکن اپنے بوئے ہوئے بیج کو اچھا سمجھتے ہیں۔

ان باتوں سے صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ پاکستان کی تحریک کا ذمہ دار جناح نہیں گاندھی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہماری یہ باتیں گاندھی پرستوں کو بہت ناگوار ہوں گی۔ لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ حقائق تلخ ہوا کرتے ہیں۔ اور ان کو ظاہر کئے بغیر قومی مسائل حل نہیں ہوسکتے۔ ہم پاکستان کو برا سمجھتے ہیں کیونکہ ہمارا خیال ہے کہ یہ گاندھیت کے بیج کا پھل ہے۔ اس سے مسلم عوام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اس سے، مسلم اکثریت والے صوبوں میں مسلم بالائی طبقوں کی گرفت مضبوط ہوسکتی ہے۔ ہماری رائے ہے کہ ہندوستان ایک ہے۔ اس کے عوام کے سیاسی اور اقتصادی مسائل ایک ہیں۔ ہندوستانی عوام کو مذہب کی بناء پر علیحدہ علیحدہ کرنا نہ مسلمانوں کے لئے اچھا ہوسکتا ہے نہ ہندوؤں کے لئے۔ نہ مجموعی طور پر ملک کے لئے۔ ہندوستان کو اکھنڈ رہنا چاہیے اور اکھنڈ رہنے ہی سے یہ ترقی کرسکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جب تک ہندوستان کی سیاسیات کی بنیاد گاندھیت پر کھڑی ہے کیا یہ اکھنڈ رہ سکتا ہے؟ ہماری رائے ہے ہرگز نہیں۔ ہماری سیاسیات میں گاندھیت اگر زندہ ہے تو ہندوستان کا تقسیم ہونا لازمی ہے۔ گاندھیت کے ہوتے ہوئے مسلمانوں کا یہ مطالبہ بالکل واجبی ہے کہ انہیں پاکستان ملنا چاہیے۔ جیسا کہ ہم نے دیکھ لیا۔ اس کا اعتراف خود مہاتما جی نے ۱۹۴۴ء میں کرڈالا۔ یہ دوسری بات ہے کہ آج وہ ہندو سرمایہ داروں کی رائے سے ڈر کر اپنے ہی طے کردہ اصول سے انحراف فرمارہے ہیں۔ لیکن اس سے حقائق پر پردہ نہیں پڑسکتا۔

ہندو پاکستان کے مخالف ہیں۔ مہاسبھائی بھی۔ کانگریسی بھی اور ہم جیسے ہندو بھی۔ لیکن جہاں مہاسبھائی اور کانگریسی چاہتے ہیں کہ گاندھیت بھی زندہ رہے۔ (کیونکہ وہ اس کو ہندوستان کا سب سے بڑا فلسفہ حیات سمجھتے ہیں۔) اور اس کے ساتھ ہی پاکستان کے خیال کو بھی نیست و نابود کردینا چاہتے ہیں وہاں ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستان کے خیال کو نابود کرنے کے لئے پہلے گاندھی ازم کو مٹانا چاہیے۔ گاندھی ازم مٹ گیا۔ تو پاکستان کی تحریک خود بخود مٹ

جائے گی۔ کیونکہ یہ گاندھیت کا ہی رد عمل ہے۔ گاندھیت کے مٹ جانے پر ہمارے وطن کی سیاسیات مذہب سے علیحدہ ہوجائیں گی۔ اور پھر ہر ایک ہندوستانی اپنے آپ کو ہندوستانی سمجھے گا۔ ہندو یا مسلمان نہیں۔

جو لوگ گاندھیت زندہ رکھتے ہیں وہ نہیں جانتے کہ غیر دانستہ طور پر وہ پاکستان کی حمایت کر رہے ہیں۔ اگر گاندھی ہمارا رہنما ہے تو کشمیر۔ صوبہ سرحد۔ سندھ ۔ بلوچستان۔ بنگال اور پنجاب میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہونی یقینی ہے۔ اس کا اعتراف خود گاندھی جی کو ہے۔ اور اسی کا نام پاکستان ہے۔

ہندوستانیوں کو فرقہ پرستی نے غلام بنا رکھا ہے۔ خصلتاً نہ مسلمان فرقہ پرست ہیں نہ ہندو لیکن چونکہ ہماری سیاسیات میں مذہبی عنصر موجود ہے اس لئے ہمارے عوام فرقہ پرست بن چکے ہیں۔ اگر ہم اپنی سیاسیات کو خالص اقتصادی بنیادوں پر کھڑا کردیں گے تو صورت حالات بدل سکتی ہیں۔ ورنہ نہیں۔

(۳ اگست ۱۹۴۳ء)

حاشیہ:۔ ۱؎ میں نے سیاسیات کشمیر کی نسبت گاندھی جی کو ایک طویل مراسلہ لکھا تھا جس کے جواب میں انہوں نے یہ چٹھی لکھی تھی۔ میں نے اس نظریے سے شدید اختلاف رکھتے ہوئے انہیں پھر ایک خط لکھا جس کا جواب بار بار یاددہانی کرانے کے باوجود مجھے کبھی نہ ملا۔ بعد ازاں میں نے اپنا مراسلہ گاندھی جی کا جواب اور اس پر اپنی تنقید پنڈت جواہر لال نہرو کے پاس بھیج دیں۔ انہوں نے جواب میں ایک خط لکھا جس سے معاملہ بہت حد تک صاف ہوگیا یہ تمام خط و کتابت ہمدرد کے ایک خاص انگریزی ضمیمہ کی شکل میں شائع ہوئی ہے۔

پاکستان کا ہوا!

ہندوستان کا سب سے بڑا سیاسی مسئلہ ہندو مسلم نااتفاقی ہے۔ یہ مسئلہ ہمارے ملک میں بہت مدت سے رونما ہے۔ اس کو سنجیدگی کے ساتھ حل کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی گئی۔ بلکہ اکثر اوقات یا تو کہا گیا کہ یہ مسئلہ موجود ہی نہیں یا اس کو برطانوی سامراج کا پیدا کردہ بتایا گیا۔ ظاہر ہے کہ ایسا کہنے سے مسئلہ تو حل نہیں ہوسکتا تھا۔ لیکن یہ برا نتیجہ ضرور نکلا کہ عوام گمراہ ہوگئے۔ اور اب جب کہ اس مسئلے نے خطرناک صورت اختیار کی عوام کی یہ گمراہی اس کے حل کرنے میں مزید دقتیں پیش کر رہی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستانی عوام کا مسئلہ فرقہ وارانہ نہیں۔ اقتصادی ہے۔ بھوک، ننگاپن اور مفلوک الحالی مسلم عوام میں بھی ویسی ہی پائی جاتی ہے جیسی ہندو عوام میں۔ پھر کوئی وجہ معلوم نہیں کہ مسلم عوام کو ہندو عوام سے کیوں الگ کیا جائے؟ اور ہندو مسلم مسئلے کو کوئی اہمیت کیوں دی جائے۔ بحث کرتے وقت یہی دلیل ہے جس کو ہندو قوم پرست لیڈر بار بار ملک کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ لیکن بغور دیکھا جائے تو ان کی زبان سے یہ دلیل درست نہیں دکھائی دیتی۔ یہ دلیل اس وقت درست ہوسکتی تھی جب کہ ہندوستان کی موجودہ سیاسی تحریک خالص اقتصادی ہوتی۔ اور حقیقتاً عوام کے فائدے کے لئے ہوتی۔ لیکن ہندوستانی قوم پرستوں نے گاندھی جی کی رہنمائی میں آزادی کی تحریک پر کافی حد تک مذہبی رنگ چڑھادیا ہے۔ اور اس کے چلانے والے ہندوؤں کے بالائی طبقے ہیں۔ کیا ہوا جو انہوں نے متذکرہ صدر دلیل کو بار بار دہرا کر ہندو عوام کو اپنا ہمنوا بنالیا ہے۔ اس حقیقت کو چھپایا نہیں جاسکتا کہ ہماری قومی تحریک میں مسلم عوام جذب نہیں ہوسکے اور ان کو علیحدہ دوسرے جھنڈے تلے جمع کردیا گیا جب حالت یہ ہے تو ہم مجبور ہیں کہ ہندو مسلم اتحاد کے مسئلے پر

غور کریں۔ اور اس کو حل کرنے کے لیے اپنی تمام قوت صرف کریں۔ یہ کہنے سے کہ ہندو مسلم مسئلہ برطانوی سامراج کا پیدا کردہ ہے ہم اپنے سوا اور کسی کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔ ہمیں تسلیم ہے کہ برطانوی سامراج ہماری اس کمزوری کو جانتا ہے اور اس نے اس کا پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ لیکن پھر بھی ہم اپنی اس کمزوری سے کیوں آنکھ بند کرلیں؟ انقلابی قوم پرستوں کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس پر پوری طرح غور کریں۔ اور اس کا حل تلاش کریں۔

ہندو مسلم اتحاد کی راہ میں اس وقت جو چیز اٹک گئی ہے وہ پاکستان کا مطالبہ ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ اتنا مشکل سوال نہیں جتنا کہ اس کو بنایا گیا ہے۔ فرقہ پرست ہندوؤں نے اس مسئلے کی غلط تعبیریں کرکے ہندو عوام کے سامنے ایک ہوا سا کھڑا کردیا ہے۔ اور اب ہندو حلقوں میں اس کا نام بھی ڈراؤنا بن گیا ہے۔ لیکن حقیقت میں ایسی کوئی بات نہیں۔

ہم مانیں یا نہ مانیں۔ ہندوستان میں اب یہ بات صاف ہوگئی ہے کہ ہندوؤں کو مسلمانوں پر اعتبار نہیں۔ اور مسلمانوں کو ہندوؤں پر بھروسہ نہیں۔ اب اس امر کے کھوج نکالنے سے کوئی فائدہ نہیں کہ اس کی ذمہ داری کن کن پر ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس کا علاج کیسے ہوسکتا ہے؟ مسلم لیگ مسلمانوں کی سب سے بڑی سیاسی جماعت ہے۔ کانگریسی رہنماؤں نے بھی اس کی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔اس لئے اگر اس مجلس کو کسی طرح سے مطمئن کرایا جاسکے تو یقیناً ممکن ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ حل ہوجائے گا۔ ہمیں غیر جانبداری سے دیکھنا چاہیے کہ اس مجلس کا مطالبہ کیا ہے۔ مسلم لیگ چاہتی ہے کہ مسلمانوں کو پاکستان کے قیام کا حق دیا جائے۔ ابتداء میں یہی رہنماء مطالبہ کرتے تھے کانگریس تسلیم کرے کہ مسلمانوں کا یہ حق بجا ہے۔ لیکن کانگریس نے ایسا کرنے سے اس لئے انکار کیا کہ مسلم لیگ تمام مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت نہ تھی۔ یہ اعتراض درست تھا۔ اور ہمارا خیال ہے کہ مسٹر جناح کو بھی اپنے دل میں اس کا احساس ہوا۔ کیونکہ جلد ہی مسلم لیگ نے اپنے مطالبہ میں ترمیم کرکے یہ کہا کہ اگر مسلم رائے عامہ پاکستان کا مطالبہ کرے تو ہندوؤں کو اس کے منظور کرنے میں کوئی اعتراض نہ ہونا چاہیے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ نہ تو مسلم لیگ اور نہ ہی دوسری مسلم انجمنوں کو اس سوال کے متعلق نمائندہ مانا جائے بلکہ مسلم عوام کو اپنا فیصلہ خود کرنے کا حق دیا جائے۔ اگر آتم نرنئے یعنی خود ارادیت کے کوئی معنی

ہیں تو صاف ہے کہ مسلم لیگ کا یہ مطالبہ سوائے ایک اعتراض کے جس کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے بالکل حق بجانب اور درست ہے۔ اور اس کو تسلیم کرنے میں کسی کو عذر نہ ہونا چاہیے۔

بدقسمتی سے بہت کم ہندو ایسے ہیں جو مسلم لیگ کے پاکستان کے مطالب پر غیر جانبدارانہ طریقہ سے بحث کرتے ہیں ہندو مہا سبھائیوں اور دوسرے کٹر فرقہ پرستوں کو تو جانے دیجئے اکثر کانگریسی ہندو بھی ہندو مسلم مسئلے کو نظر انداز کر کے تحریک حریت کو چلانا چاہتے ہیں۔ اور پھر سمجھتے ہیں کہ وطن آزاد ہوا ہی چاہتا ہے! انہوں نے دل میں یقین کر رکھا ہے کہ قوم پرستی اور حب الوطنی کی اجارہ داری پہلے انہوں نے اور پھر ہندو عوام نے لے رکھی ہے۔ مسلمان ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک غدار اور قوم کش ہیں۔

ہندو کہتے ہیں کہ بھارت ورش ہمیشہ اکھنڈ تھا۔ اور آئندہ بھی اکھنڈ رہنا چاہیے۔ پاکستان کے مطالبہ کو قبول کرنا وطن کو تقسیم کرنے کے برابر ہوگا۔ کوئی بھی محب وطن اس مانگ کو تسلیم نہیں کرسکتا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کی صحیح تاریخ کو جاننے والا کبھی ایسی بچوں کی سی باتیں نہیں کرسکتا۔ ہندوستان کبھی اس طرح اکھنڈ نہیں تھا جس طرح ہم کو اب سنایا جارہا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ قومیت کا ایسا خیال ہندوستانیوں کے دلوں میں کبھی پیدا ہی نہیں ہوسکتا تھا۔ جیسا کہ اس وقت پیدا ہوا ہے۔ کیونکہ قومیت کی موجودہ تعبیر اس زمانے کی ایجاد ہے۔ زمانہ سلف یا زمانہ وسطی میں یہ پیدا ہی نہیں ہوسکتا تھا جیسا کہ اس وقت۔ اولاً" کل ہندوستان (جس کو کہ ہم اس وقت کل ہندوستان کہتے ہیں ۔ یعنی کشمیر سے راس کماری تک) کسی وقت پر بھی ایک ایڈمنسٹریشن یا نظام کے ماتحت نہیں رہا۔ ثانیاً" اگر یہ کہا بھی جائے کہ مہاراجہ اشوک یا اکبر اعظم جیسے بادشاہوں کے عہد میں ہندوستان کا اکثر حصہ ان کے ماتحت تھا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ عوام کی رائے سے نہیں بلکہ بادشاہ کی فوجی فتوحات کی وجہ سے ایک بن گیا تھا۔ ہم اب جس آزاد ہندوستان کو ایک بنانا چاہتے ہیں اس کا اور اس کا مقابلہ کس طرح کیا جاسکتا ہے؟

پاکستان کیا ہے؟ کئی وطن دشمن ہندو اخبار نویس ہندوؤں کو بتاتے رہتے ہیں کہ اس کا مطلب شریعت کا اسلامی راج ہے۔ پاکستان میں ہندوؤں کا قافیہ تنگ کیا جائے گا۔ وہ یا تو مجبور ہوں گے کہ اسلام قبول کریں یا ان کو وہاں سے بھاگنا پڑے گا وغیرہ ۔ یہ بہتان ہے اور

ہمیں سخت افسوس ہے کہ اس کے پھیلانے سے یہ اخبار نویس نہ صرف ہندو عوام کو گمراہ کرتے ہیں بلکہ ایسا کرنے سے حب الوطنی کے اجارہ دار ہو کر بھی خود ہی وطن کی آزادی کی راہ میں نئی نئی مشکلات پیدا کر دیتے ہیں۔ پاکستان کا مسئلہ بجز اس کے کچھ نہیں کہ ہندوستان کی ان صوبجات میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے انہیں حکومت کرنے کا حق حاصل ہو۔ ایک طرح سے پاکستان ان صوبوں میں آج کل بھی کارفرما ہے۔ کیونکہ جب سے ۱۹۳۵ء کا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ نافذ ہوا ہے۔ اور ہندوستانی صوبوں کو آزادی ملی ہم دیکھ رہے ہیں کہ پاکستانی صوبوں (یعنی پنجاب۔ سندھ۔ صوبہ سرحد۔ اور بنگال) میں مسلمان وزیراعظم اپنی وزارتیں بنا کر صوبوں کی حکومت چلا رہے ہیں۔ یہ بھی تو پاکستان ہی ہے۔ صرف اب اتنا کچھ اور ہو گا کہ اگر ان میں سے کوئی صوبہ چاہے تو مرکزی حکومت سے علیحدہ ہو سکتا ہے۔ اگر صرف اتنی ہی بات ہندوستان کو برطانوی سامراج کی غلامی سے آزادی دلا سکتی ہے تو وہ ہندو جو اپنے آپ کو ہندوستان کی آزادی کے واحد اجارہ دار سمجھ بیٹھے ہیں۔ اور برطانوی سامراج کو وطن کا سب سے بڑا دشمن قرار دیتے ہیں، پاکستان کو کیوں تسلیم نہیں کرتے؟ اگر ہندو سچ مچ مسلمانوں کو دبانا نہیں چاہتے ۔ اور اگر ان کا یہ خیال درست ہے جیسا کہ وہ کہتے ہیں کہ کوئی صوبہ مرکز سے علیحدہ ہونے پر اپنے آپ کو تباہ کرنے کے سوا کچھ نہ کر سکے گا۔ تو پاکستان کے بن جانے کا خوف کیسا؟

سچ بات تو یہ ہے جو ہندو قوم پرستوں کو بڑی تلخ معلوم ہوتی ہے کہ ہمارے وطن کی موجودہ تحریک حریت ہندو بالائی طبقوں کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ لوگ وطن کی آزادی پر اپنے مفاد کو ترجیح دیتے ہیں۔ عوام کے نام پر دنیا کی آنکھوں میں دھول ڈالتے ہیں۔ ہندو مسلم مسئلہ ان ہی لوگوں کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اگر عوام (جذباتی طور پر نہیں، دانستہ طور پر اور پورے احساس کے ساتھ) اس تحریک کے ساتھ ہوتے تو نہ ہی ہندو مسلم سوال پیدا ہوتا نہ پاکستان کا ہوا نمودار ہوتا۔ کیونکہ پھر آزادی وطن کو ہر ایک بات پر ترجیح دی جاتی۔ اس وقت ہندو گاندھی پرست ہمیں بتا رہے ہیں کہ قریباً" تمام مسلمان غدار ہیں اور وہ ہندوستان کو آزاد نہیں ہونے دیتے۔ لیکن ان کی اپنی حالت یہ ہے کہ وہ خود صرف اس لئے ہندوستان کو برطانوی سامراج کا غلام بنائے رکھنا برداشت کرتے ہیں تاکہ چند ہندوستانی صوبوں کو مرکز سے علیحدہ ہونے کا حق نہ دیا جائے۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب سے قبل روس کا بھی یہی حال تھا۔ روسی

قوم پرست جو زارشاہی کے دست نگر تھے تمام غیر روسی قوموں کو دباتے تھے۔ اور اسی کا نام قومیت اور قوم پرستی بتاتے تھے۔ جمہور کے انقلاب کے بعد یہ حالت نہ رہی انقلابی سوشلسٹ رہنماؤں نے تمام صوبوں اور قوموں کے اس حق کو تسلیم کیا کہ وہ چاہیں تو مرکزی حکومت کے ساتھ رہیں اور نہ چاہیں تو علیحدہ ہوجائیں۔ اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ زارشاہی کی دبائی ہوئی اقلیتوں کو سوشلسٹ حکومت پر بھروسہ اور اطمینان ہوا۔ اور چند سالوں کے اندر تمام وہ صوبے اور اقلیتیں اپنی مرضی سے پھر مرکز کے ساتھ مل گئیں جو پہلے علیحدہ ہوگئی تھیں۔

ہماری رائے ہے کہ ہندوستان میں بھی یہی ہونا چاہیے۔ سوال یہ ہے کہ کیا موجودہ قوم پرست قیادت ایسا کرنے کی جرات کرسکتی ہے؟ گاندھی جی نے کہا ہے کہ اگر مسلمان چاہتے ہوں کہ انہیں پاکستان ملنا چاہئے تو کوئی طاقت نہیں جو انہیں اس کے حاصل کرنے سے روک سکتی ہے۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اپنے دہلی والے ریزولیشن میں بھی مان لیا ہے کہ اگر صوبے علیحدگی کا مطالبہ کریں تو ان کو ایسا کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ اگر یہ نمائشی باتیں نہیں تو ہم سمجھ نہیں سکتے کہ ہندو مسلم مسئلہ حل کیوں نہیں ہوتا۔ اور اکثر ہندو لیڈر اور ہندو اخبار نویس پاکستان کو ہوا کیوں بنارہے ہیں اور ہندو عوام کو کیوں ڈرا رہے ہیں۔ ہمیں مسلم لیگ کے مطالبہ کے خلاف ایک اعتراض ہے وہ یہ کہ ہم یہ نہیں مانتے کہ صوبوں کی علیحدگی کے اصول کو صرف مسلم رائے عامہ سے منظور کیا جانا چاہیے۔ یہ اصول تو تبھی تسلیم کیا جاسکتا ہے جب ان صوبوں میں رہنے والے ہندو اور مسلم باشندگان اکٹھے مل کر علیحدگی کا فیصلہ کریں۔ ورنہ نہیں۔ صرف مسلم رائے عامہ سے ہی یہ فیصلہ کرنا غیر جمہوری اور سراسر نامنصفانہ ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ مسلم لیگ کو اپنے نظریے میں یہ ترمیم ضرور کرنی چاہیے۔

ہندوستان کے ہندو اور مسلم آزادی چاہنے والے وطن پرستوں کا فرض ہے کہ وہ اس معاملے میں غیر جانبدار ہوکر رائے عامہ کی صحیح رہنمائی کریں۔ ہندوؤں کا فرض ہے کہ پاکستان کو ہوا بنانے کے بدلے ہندو عوام کو اصلیت بتادیں اور ان پر واضح کریں کہ یہ مسئلہ ڈراؤنا نہیں، ایک سنجیدہ سوال ہے۔ اور اس کا حل آسان ہے۔ ہم ہندوستان کی آزادی چاہتے ہیں۔ ایسی آزادی جس میں مسلمان بھی مطمئن ہوں۔ اگر وہ صوبوں کی علیحدگی کے اصول کو تسلیم کرنے سے ہی ہوسکتی ہے تو ہمیں ایسا کرنے سے نہ جھجکنا چاہیے گو اس کا نام پاکستان

ہی رکھا جائے۔

مسلمانوں کا فرض ہے کہ مسلم عوام کو سمجھادیں کہ پاکستان کا مسئلہ تب تک حل نہ ہوگا جب تک ہم پاکستان میں رہنے والے غیر مسلموں کو بھی اطمینان نہ دلادیں کہ ان کی رائے عامہ کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان کا بھی پاکستانی صوبوں پر اتنا ہی حق ہے جتنا ان صوبوں میں رہنے والے مسلمانوں کا۔

۲۵ اکتوبر ۱۹۴۳ء

کشمیر کے سوشلسٹوں کا نظریہ

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس منعقدہ بمبئی اور توڑ پھوڑ تحریک کے سلسلے میں کانگریسی رہنماؤں کی گرفتاری کے بعد کشمیر کے سوشلسٹوں کا ایک اجلاس ۲۶ اگست ۱۹۴۲ء کو ہوا۔ اس میں قرار پایا کہ موجودہ حالات کی نسبت ان کو اپنا نظریہ دنیا کے سامنے رکھ دینا چاہیے۔ اور اس مرحلے پر ملک کی رہنمائی کرنی چاہیے۔ چنانچہ ایک مسودہ تیار کیا گیا جس میں صرف وہی خیالات درج تھے۔۔ جن کے متعلق تمام سوشلسٹوں کے متذکرہ صدر اجلاسوں میں مکمل اتفاق کیا جاچکا تھا۔۔ بدھ وار مورخہ ۲ ستمبر ۱۹۴۲ء کے اجلاس میں یہ مسودہ پاس کردیا گیا۔ مذکورہ بیان یہ ہے:۔

"دنیا کی موجودہ بین الاقوامی جنگ تمام سابقہ جنگوں کی نسبت اس بات میں نرالی ہے کہ اس نے سماج کی طبقاتی کشمکش کو بالکل آشکارا کردیا ہے۔ یہ جنگ سابقہ جنگوں کی طرح بالائی طبقوں سرمایہ داروں اور سامراجی حکومتوں کی باہمی رقابتوں کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ یہ از [illegible] آزادی اور حقیقی جمہوریت کو قائم کرنے کے لئے لڑی جارہی ہے۔ اس [illegible] صرف فاشسٹ ہیں جو سرمایہ داروں کے سامراج کو جابرانہ صورت میں [illegible] لے خواہاں ہیں۔ اور دوسری طرف سماج کے وہ تمام عناصر اکٹھے ہوئے ہیں جو اپنی خوشی سے یا حالات سے مجبور ہوکر دنیا میں جمہوریت آزادی کے جھنڈے کو لہراتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔"

فاشسٹ کون ہیں؟ وہ کیا چاہتے ہیں۔ ان کا مدعا کیا ہے۔ نصب العین کیا؟ یہ سب ان کے قول و فعل سے صاف ثابت ہوتا ہے۔ فاشسٹوں کا سب سے بڑا لیڈر ہٹلر ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ انسان کی تمام نسلیں ایک جیسی نہیں۔ چند ایک اعلیٰ ہیں۔ باقی ادنیٰ۔ اعلیٰ نسلیں جن میں جرمن قوم سب سے بہترین ہے۔ دنیا میں حکومت کرنے کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ اور باقی نسلیں ان کے ماتحت رہنے کے لئے معرض وجود میں آئی ہیں۔ فاشسٹ انسانوں

کو مساوی درجہ دینے سے انکار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں چند افراد اور اقوام کو ازلی فوقیت حاصل ہے۔ اسی لئے نازیوں نے جرمن قوم میں بھی طبقے اور درجے بنا رکھے ہیں۔ بالائی طبقوں کا کام حکومت کرنا اور عیش و عشرت منانا ہے۔ نچلے طبقے ان کی خدمت کرتے ہوئے ہی اپنی زندگی گذار سکتے ہیں۔ نازی عورتوں کو بھی مردوں کے ساتھ برابر درجہ دینے سے انکاری ہیں۔ وہ ان کو صرف جنگ کے لئے سپاہی پیدا کرنے اور گھر کا کاروبار کرنے تک محدود رکھتے ہیں۔

فاشسٹوں کے اس فلسفہ کے پیش نظر یہ تعجب نہیں کہ وہ روئے زمین کے ہر حصے پر چھا جانا چاہتے ہیں۔ اور تمام انسانوں کو اپنے ماتحت کر کے ان سے غلاموں کی طرح کام لینا چاہتے ہیں۔ اپنے وطن جرمنی میں تمام حریت پرور اور اشتراکیت پسندوں کو موت کے گھاٹ اتارنے یا قید خانے میں ڈالنے کے بعد فاشسٹوں نے ہمسایہ ملکوں اور اقوام کو اپنے قبضہ میں کرلیا۔ مفتوحوں کے ساتھ جو سلوک کیا گیا اس کے سننے سے بدن کو رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ اور ایسا دکھائی دیتا ہے کہ یہ حرکتیں درندے اور حیوان ہی کر سکتے ہیں۔ انسان نہیں۔

لیکن اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں۔ کیونکہ فاشسٹ لیڈروں کا یہ عقیدہ ہے کہ حکومت قائم کرنے کے لئے اوچھے سے اوچھا ہتھیار بھی استعمال کرنا پڑے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ جنگ سے قبل ہی ہٹلر کہتا تھا کہ "دنیا کو فتح کرنے کے لئے جرمنوں کو ہر ایک ہتھیار استعمال کرنا پڑے گا۔ اپنی سلطنت قائم کرنے کے لئے اگر ہم کو روس۔ پولینڈ۔ زیکوسلاواکیہ۔ بلغاریہ اور یوکرین کے تمام باشندوں کا بھی قلع قمع کرنا پڑے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم ایسا کیوں نہ کریں۔" اس کا قول یہ ہے کہ "انسان گنہگار پیدا ہوتا ہے۔ اس کو تشدد کے ذریعہ سے ہی دبایا اور قابو میں رکھا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ برتاؤ کرتے وقت ہر ایک قسم کے ہتھیار کا استعمال جائز ہے۔ جب ضرورت پڑے ہمیں جھوٹ بولنے اور دغا بازی کرنے اور قتل کرنے سے بھی احتراز نہ کرنا چاہیے۔"

ہٹلر کے دست راست مارشل گوئرنگ کو اپنے ماتحتوں سے یہ کہتے ہوئے کوئی ہچکچاہٹ نہ ہوئی۔ "ان سب کو جو ہمارے مخالف ہیں قتل کر ڈالو۔ قتل کرو۔ قتل کرو۔ تمہیں کوئی قصوروار نہ ٹھہرائے گا۔ میں ذمہ دار ہوں گا۔ لہٰذا قتل کرو۔ بلا جھجک قتل کرو۔"

ہٹلر کہتا ہے کہ "میں نے انسان کو اس بے عزتی کے عنصر سے آزاد کرایا جس کو عرف

عام میں "ضمیر" کہتے ہیں۔ ضمیر تعلیم کی طرح انسان کو کمزور بناتی ہے اور کہیں کا نہیں رکھتی۔ مجھے فوقیت حاصل ہے۔ کیونکہ میرا کوئی ضمیر نہیں اور نہ ہی مجھے اصولی یا اخلاقی وجہ پریشان کرسکتی ہے۔"

فاشسٹوں کے اعتقادات فلسفہ اور عقائد پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے۔ اور حقیقتاً اس پر ضخیم کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔ لیکن یہ مشتے نمونہ از خروارے ہے۔اور فاشسٹ لیڈروں کی اپنی زبان سے ہے۔

ہمیں دیکھنا چاہیے کہ فاشسٹ تحریک دنیا میں پیدا کیسے ہوئی۔۔ اور اس کی ترقی کے اسباب کیا ہوئے؟ ایسا کرنے کے لئے ہمیں پچھلی جنگ عظیم سے لے کر موجودہ جنگ کی ابتداء تک کے بین الاقوامی حالات پر سرسری نظر ڈالنی پڑے گی۔

یہ تو معلوم ہی ہے کہ پچھلی جنگ سامراجی تھی جس میں جرمنی کو شکست ہوئی۔ فاتح سامراجی حکومتوں نے فتح کے نشے میں فیصلہ کیا کہ وہ شکست خوردہ جرمنی پر ایسی شرطیں ٹھونس دیں تاکہ پھر کبھی وہ سر نہ اٹھا سکے۔ صلح نامے درسائی ایسے ہی شرائط کا پلندہ ہے۔ لیکن جب کچھ مدت کے بعد سامراجی حکومتوں کو جن میں پیش از پیش برطانیہ تھا صاف دکھائی دینے لگا کہ جرمنی ان سب شرطوں کو پورا نہ کرسکے گا۔ اور اگر وہ ان کو پورا کرنے پر زور دیں گی تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ جرمنی میں ایسا سماجی انقلاب آجائے گا جس میں حقیقی جمہوریت پرست اور اشتراکیت پسند عناصر طاقت ور بن کر عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیں گے تو وہ ڈر گئیں۔ انہوں نے اپنی پالیسی بدل ڈالی۔ اور یہ فیصلہ کیا کہ جرمنی میں سرمایہ داروں کو پھر مضبوط بنایا جانا چاہیے۔ جس سے وہاں کی حکومت پر ان کا پورا تسلط ہو۔ تاکہ ایسی حکومت نہ صرف جرمنی کے جمہور کو دبائے رکھے بلکہ اشتراکی روس کا مقابلہ بھی کرسکے۔ اور مغربی یورپ کی سرمایہ دارانہ حکومتیں سماجی اور سیاسی انقلاب سے بچی رہیں۔

سامراجیوں کی اس پالیسی کی بدولت جرمنی کے سرمایہ دار از سر نو منظم ہونے لگے۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ایسا کرنا ان کے لئے آسان تھا۔ ان کے ملک میں اشتراکی اور حریت پرست عناصر بالکل کمزور نہ تھے۔ لیکن کچھ تو سامراجی حکومتوں کی امداد سے اور کچھ جرمن جمہور کے سوشلسٹ رہنماؤں کی غلطی سے وہاں سرمایہ داروں نے اپنا سکہ جمالیا۔ بیشک ایسا کرنے کے لئے انہیں بڑی خانہ جنگی کرنا پڑی۔ خون کی ندیاں بہانی پڑیں۔ بچوں۔ بوڑھوں

عورتوں پر بھی ہاتھ صاف کرنے پڑے مساوات اور جمہوریت کا گلا گھونٹنا پڑا۔ آزادی کو کچلنا پڑا۔ تہذیب' اخلاق اور روحانیت کو پاؤں تلے روندنا پڑا۔ سائنس دانوں۔ فلاسفروں اور ڈاکٹروں کو بے عزت کرکے دیس بدر کرنا پڑا لیکن انہوں نے کسی سے احتراز نہ کیا۔ بلکہ اپنی ان حرکات کو درست اور حق بجانب ثابت کرنے کے لئے سرمایہ داروں نے نیا فلسفہ تیار کیا۔ نئے اقتصادی اور سیاسی اصول بنائے۔۔ ان ہی کا نام فاشزم ہے۔ اور اس فاشزم کا نمونہ ہم نے اوپر پیش کردیا ہے۔

اصلیت یہ ہے کہ دنیا میں سرمایہ داری اور سامراج کے آخیری دن آگئے ہیں۔ پچھلی جنگ کے دوران میں دنیا کے چھٹے (۱/۶) حصے یعنی روس میں اس کا خاتمہ ہوگیا۔ تب سے ہی بین الاقوامی سرمایہ داری اور سامراج اپنی موت کا دن آتے دیکھ رہے ہیں۔ اور وہ کوششیں کر رہے ہیں کہ کسی طرح زندہ رہیں۔ بہت مدت تک دنیا میں سرمایہ داری اور سامراجیوں نے اپنے آپ کو جمہوریت اور آزادی کا علمبردار بتایا۔ ان کی جمہوریت اور آزادی ان کے اپنے طبقے کے لئے تھیں۔ تمام انسانوں کے لئے نہیں۔ جب عوام نے بھی بیدار ہوکر اس میں حصہ لینے کا مطالبہ کیا تو وہ خوف کھاگئے۔ اور کچھ عرصہ قسم قسم کے اصلاحات پیش کرتے گئے۔ لیکن حقیقی طاقت اپنی گرفت میں ہی رکھے رہے۔ جب نچلے طبقے کے لوگوں نے زور حاصل کرنے کے لیے ڈٹ کر مقابلہ کیا تو سامراجیوں نے "جمہوریت اور آزادی" کے ڈھونگ کو ایک طرف چھوڑ کر عوام کو دبانے کے لئے تشدد سے کام لیا۔ اس کا نام فاشزم ہے۔ فاشزم کے پیدا ہونے کی یہی وجہ اٹلی میں بھی ہوئی۔ جاپان میں بھی اور جرمنی میں بھی۔ جرمن فاشسٹ کہتے ہیں کہ وہ نیشنل سوشلسٹ یعنی قومی اشتراکیت کے علمبردار ہیں۔ یہ صرف اس لئے کہاجاتا ہے کہ جرمنی کے عوام کو گمراہ کیا جائے جمہور کو اپنی گرفت میں رکھا جائے۔ دنیا کے حریت پسند لوگوں کی آنکھوں میں دھول ڈالی جائے اور نازی تحریک کے لئے ان کی حمایت حاصل کی جائے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ نازی نہ تو نیشنلسٹ ہیں اور نہ سوشلسٹ۔ نیشنلسٹ وہ اس لئے نہیں کیونکہ ان کی تحریک جرمن قوم کے اجتماعی مفاد کے لئے نہیں بلکہ صرف جرمن سرمایہ داروں کے مفاد کے لئے ہے ۔ اور وہاں کے مزدور۔ کسان اور دوسرے طبقے ایسے بدترین طریقہ سے چوسے جاتے ہیں جس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ سوشلسٹ وہ اس لئے نہیں کیونکہ وہاں کارخانے۔ زمینیں اور دوسرے آمدنی کے ذرائع

عوام کی مشترکہ جائداد نہیں۔ جیسا کہ سوشلزم کے اصول کے مطابق ہونا چاہیے بلکہ ان ہی سرمایہ داروں کی ذاتی جائدادیں ہیں اور حکومت پر بھی ان ہی سرمایہ داروں کا مکمل قبضہ ہے۔ عوام کا اس پر بھی کوئی اثر نہیں۔

فاشسٹ دنیا پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ کس لئے؟ دنیا کو آزاد کرنے کے لئے نہیں بلکہ اس کو غلام بنانے کے لئے۔ تاکہ حکمران فاشسٹ طبقہ عیش منائے۔ وہ جانتے ہیں کہ اب اٹھارویں یا انیسویں صدی نہیں۔ جب سرمایہ داروں نے آسانی سے نو آبادیات حاصل کی تھیں ۔ اور وہاں کے عوام کو اپنا غلام بنالیا تھا۔۔ اس بیسویں صدی میں اشتراکی اور عوامی طاقتیں بیدار ہوچکی ہیں۔ انسان سیاسی اور اقتصادی زندگی میں مساوات کا طلبگار ہے۔ اس لئے فاشسٹوں نے تہیہ کرلیا ہے کہ وہ ظلم و ستم درندگی و حیوانیت اور جور و جبر کا دور قائم کرکے ہی دم لیں گے تاکہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوں۔ اور انہوں نے قول و فعل سے ثابت کردیا ہے کہ وہ اپنے اس ارادے پر چٹان کی طرح ڈٹے ہوئے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ جرمن فاشسٹوں کو برطانیہ کی سامراجی حکومت نے جنم دیا۔ اس نے دوسری سامراجی حکومتوں کے ساتھ مل کر اس کو پالا پوسا۔ مضبوط اور منظم بنادیا۔ یہ بھی درست ہے کہ جرمنی اور برطانیہ کے درمیان موجودہ جنگ کی وجہ یہ تھی کہ برطانوی سامراج کو ڈر لگا کہ اس نے جس دیو کو اشتراکیت کا مقابلہ کرنے کے لئے کھڑا کیا تھا وہ اس کا اپنا رقیب ثابت ہورہا ہے۔ اور آپے سے بھی باہر ہورہا ہے۔ دنیا کی لوٹ کھسوٹ میں حصہ مانگتا ہے۔ ورنہ جنگ پر تلا ہوا ہے اشتراکیت پھیلنے کے خوف سے سامراجی جنگ کے خلاف تھے۔ اس لئے انہوں نے ہٹلر کو خوش کرنے کی انتہائی کوشش کی۔ بلکہ جنگ شروع ہونے کے بعد بھی مسٹر چیمبرلین کی برطانوی حکومت چاہتی تھی کہ ہٹلر کو خوش کرکے مطمئن کرو نے۔ لیکن اس وقت معاملہ سامراجیوں کے ہاتھ سے نکل چکا تھا کیونکہ جنگ کی وجہ سے دنیا میں انقلاب پیدا ہورہا تھا جس نے عوام کی طاقتوں کو بیدار کردیا تھا اور حساس غریب طبقوں نے محسوس کرلیا تھا کہ اگر فاشسٹ تحریک کا لیڈر--- ہٹلر--- لڑنے بھڑنے کے بغیر ہی کامیاب پر کامیابی حاصل کرتا رہا۔ تو ایک دن آئے گا جب فاشسٹوں کا دنیا پر قبضہ ہوجائے گا۔ اور عوام کی آزادی کی تمام امیدیں ملیامیٹ ہوجائیں گی۔ اس لئے ضروری ہے کہ فاشزم کو اسی موقعہ پر کچل کر نیست و نابود کردیا جائے۔ اسی وقت سے انگلستان کی اشتراکی اور عوامی

طاقتیں فاشزم کو فنا کرنے کے تاریخی کام کو سرانجام دینے کے لئے منظم ہونے لگیں۔۔ اگر یہ بالکل کمزور ہوتیں تو یقین تھا کہ برطانیہ کے چیمبرلین جیسے سامراجی اور سرمایہ دار، ان کو دبا لیتے ان پر غلبہ پاتے۔ اور اس کے بعد ہٹلر کے ساتھ سمجھوتہ کرکے اپنے ملک میں بھی فاشسٹ طرز کی حکومت قائم کرلیتے۔ ایسا نہ ہوا بلکہ اس کے عوض حریت پرستوں اور اینٹی فاشسٹوں کے زور کی وجہ سے چیمبرلین کو نکال دیا گیا۔ اور اس کے بدلے برطانیہ کی عنان وزارت چرچل کے ہاتھ میں سونپ دی گئی جو کہ گو سرمایہ پرست اور سامراجی ضرور ہے لیکن اس کے ساتھ ہی فاشزم کا بھی شدید ترین دشمن ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تبدیلی وزارت نے جنگ کا پہلو بدل دیا۔اور وہ خالص سامراجی نہ رہی بلکہ اینٹی فاشسٹ بھی ہوگئی۔اور اس نے دوسرا ہی رخ اختیار کیا۔

اس سمت چلنے سے جنگ نے آہستہ آہستہ اپنا رنگ ہی بدل دیا۔ کیونکہ اس کے بعد بین الاقوامی حالات نے برطانیہ کے ساتھ اشتراکی روس اور حریت پرست چین کو بھی لا کھڑا کردیا۔ جس سے یہ صاف ہوگیا کہ جنگ سامراجی نہیں رہی، عوامی بن گئی ہے۔ کیونکہ اب اس میں نہ صرف قریباً" تمام دنیا شامل ہوگئی ہے بلکہ ایک طرف وہ طاقتیں اور عناصر جمع ہوگئے ہیں جوانسانوں کی حقیقی آزادی کے علمبردار ہیں۔ اور دوسری طرف وہ حکومتیں ہیں جو اکثر انسانوں کو غلام رکھنے کا تحریری اور تقریری اعلان کرچکی ہیں۔ اور اس بنیاد پر اپنے عقائد۔ اپنا فلسفہ اور اپنے اقتصادی و سیاسی اصول بھی بناچکی ہے۔

اس جنگ کی ایک خصوصیت قابل ذکر اور بار بار یاد رکھنے کے لائق ہے۔ وہ یہ کہ ظاہراً" یہ ملکوں اور حکومتوں کے درمیان لڑی جارہی ہے۔ لیکن دراصل یہ عقائد کی جنگ ہے۔ ایک طرف بین الاقوامی فاشزم ہے اور دوسری طرف حقیقی جمہوریت۔ یعنی ایک طرف رجعت پسندی ہے اور دوسری طرف حریت پرستی۔ ہر ملک میں ایسے لوگ موجود ہیں جو فاشزم کے فلسفہ اور سیاسی و اقتصادی اصولوں کو مانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس سے دنیا کا بھلا ہوسکتا ہے۔ اسی طرح ہر ملک میں حقیقی آزادی کے بھی پرستار ہیں جو انسانوں کے اندر سچی اقتصادی و سیاسی مساوات پھیلنے اور جمہوریت کا جھنڈا لہرانے میں ہی دنیا کی نجات دیکھتے ہیں۔ غرضیکہ جہاں برطانیہ میں فاشسٹ خیالات کے لوگ موجود ہیں وہاں جرمنی میں میں اشتراکیت پسندوں اور جمہوریت پرستوں کی کمی نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ اپنے ملکوں میں

رہتے ہوئے بھی دشمن کے فلسفہ اور عقائد کے موئد ہیں۔

جنگ کے اس پس منظر اور اصولی وجوہات کو سمجھنے کے بعد یہ دیکھنا مشکل نہیں کہ دنیا اس وقت کس نازک ترین مرحلے سے گذر رہی ہے۔ اور انسان پر اس وقت کتنا اہم اور بڑا بھاری فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے مستقبل کو پہچانتے ہوئے اپنے لئے دو میں سے کسی ایک عقیدے کا انتخاب کرے اور پھر اس جنگ میں حصہ لے۔ اس جنگ کے نتیجہ سے ہر ایک انسان کی زندگی پر اثر پڑے گا۔ سابقہ جنگوں کا اس کے ساتھ مقابلہ کرنا بڑی بھاری غلطی ہے۔ کیونکہ اس کے خاتمہ پر عام انسان جیسے تھے تقریباً ویسے ہی رہے۔ ایسا اب کی بار نہ ہوگا۔ کیونکہ اگر فاشسٹ جیت گئے تو دنیا میں رجعت پسندی کا ایسا زبردست دور شروع ہوگا جو تاریخ کے تاریک ترین دور سے کسی طرح بھی کم ہیبت ناک نہ ہوگا۔ انسانوں کی وہ آزادی ختم ہوجائے گی جس کو انہوں نے سینکڑوں سالوں کی جدوجہد کے بعد حاصل کر رکھا تھا۔ سائنس اور انقلابی فلسفہ کا ناش ہوگا سماج کی ترقی رک جائے گی۔ اور انسانوں کو غلامی کی سی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔ اس کے برعکس اگر فاشسٹوں کو شکست ملی تو دنیا میں نہ صرف موجودہ صورت ہی برقرار رہے گی بلکہ سماجی انقلاب سے گذر کر ترقی کرے گی۔ سرمایہ داری اور سامراج ختم ہوجائیں گے یا کم از کم بے حد کمزور ہوکر رہیں گے۔ اور ان کو نابود کرنا بالکل آسان ہوجائے گا۔ اس لئے یقینی ہے کہ غریبوں اور غلام قوموں کی سیاسی اور اقتصادی حالت پلٹا کھائے گی۔۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی تمام اقوام اور افراد نے بین الاقوامی سیاسیات کے متعلق اپنا اپنا یکطرفہ فیصلہ کر رکھا ہے جو لوگ آزادی اور جمہوریت چاہتے ہیں وہ فاشسٹوں کے خلاف ہیں اور جو عوام کو اپنے اغراض کے لئے غلام بنائے رکھنا چاہتے ہیں۔ حقیقی جمہوریت اور اشتراکیت کے پھیلنے سے ڈرتے ہیں وہ فاشسٹ نواز ہیں۔

بدقسمتی سے ایک ہندوستان ہے جہاں کے عوام کے دماغ میں الجھن ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ اول تاریخی ہم غلام ہیں' برطانوی سامراج نے ہم کو تقریباً" دو صدیوں سے اپنی ماتحت کر رکھا ہے اور وہ اس لمبے عرصے میں ہمیں اقتصادی طور پر چوستا رہا ہے۔ سیاسی طور پر دباتا رہتا ہے اور روحانی طور پر ذلیل کرتا رہا ہے۔ پچاس سال سے ہم آہستہ آہستہ بیدار ہو رہے ہیں۔ اور ہم نے برطانوی سامراج کے خلاف محاذ قائم کیا ہے۔ ہمیں برطانوی سامراج سے نفرت ہے اور ہم بجا طور پر اس سے آزاد ہونا چاہتے ہیں تاکہ ترقی کرسکیں۔ اور

اپنا مستقبل شان دار بنا سکیں لیکن ہم آج یہ دیکھ کر حیران ہو رہے ہیں کہ برطانوی سامراج حریت پرستوں اشتراکیت پسندوں اور جمہوریت نوازوں کا طرفدار ہے اور انسان کش فاشزم کے خلاف لڑ رہا ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ ہمارے دماغ میں الجھن پیدا ہوگئی ہے کہ کس طرف جائیں۔ عقل کہتی ہے کہ فاشزم کے خلاف لڑو جس کا مطلب یہ ہے کہ اتحادیوں کی امداد کرو۔ برطانیہ کا حوصلہ بڑھاؤ لیکن دل یہ ماننے پر تیار نہیں ہوتا۔

ہمارے اس تذبذب کا علاج ہمارے قومی رہنماء کر سکتے تھے۔ لیکن بدقسمتی سے وہ الجھن کو دور کرنے کی بجائے اس میں مزید گانٹھیں لگا بیٹھے ہیں۔ ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت انڈین نیشنل کانگریس ہے۔ اس کے نیتا مہاتما گاندھی ہیں۔ کانگریسی رہنما متفقہ طور پر اعلان کر چکے ہیں کہ فاشزم دنیا کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ خلاف انسانیت ہے' رجعت پسندانہ ہے اور کیا کچھ نہیں۔۔ پنڈت جواہر لال نہرو ہزار بار بتا چکے ہیں کہ انہیں فاشزم سے خطرہ ہے۔ فاشسٹوں کی کم و بیش تمام حرکتوں سے نفرت ہے۔ ان کے فلسفے ان کے سیاسی اور اقتصادی عقائد سے زبردست اختلاف ہے۔ یہی رائے دوسرے کانگریسی لیڈروں کی بھی ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ لیڈر آج تک اتنا بھی قطعی طور پر فیصلہ نہ کر سکے کہ انہیں اس جنگ میں کن کا ساتھ دینا چاہیے۔ اس سے بھی زیادہ افسوسناک حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ دو سال کے دوران میں کانگریس نے جو کچھ بھی عملاً" کیا اس سے فاشسٹوں کو مدد ہی ملتی گئی۔ اور حریت پرست اتحادیوں کو زک ہی پہنچتی گئی۔۔ اور اس زک کی سب سے خطرناک صورت یہ ہے کہ آج ہندستان کے عوام کی ذہنیت فاشسٹ نواز بن گئی ہے۔ گو اعلانیہ طور پر تمام ہندوستانی بتا رہے ہیں کہ وہ فاشسٹوں کے خلاف ہیں۔ لیکن جب پرائیوٹ طور پر ان کے دلوں کو ٹٹولا جاتا ہے تو یہ حوصلہ شکن حقیقت صاف نظر آتی ہے کہ وہ فاشسٹوں کو برا نہیں مانتے اور بسا اوقاف اعتراف کرتے ہیں کہ وہ ہندوستان کے لئے اچھے ہی ثابت ہوں گے۔

کانگریسی لیڈروں نے جنگ کے دوران میں عجیب و غریب باتیں کیں۔۔ خود مہاتما گاندھی نے حیران کن حرکتیں کیں۔ جنگ کے شروع میں انہوں نے وائسرائے کے ساتھ ملاقات کرنے کے بعد ایک اخباری بیان میں بتایا کہ جہاں تک ان کی ذات کا تعلق ہے وہ چاہتے ہیں کہ برطانیہ کی غیر مشروط طور پر امداد کریں۔۔ انہوں نے فرمایا کہ ان کے دل پر اس تصور سے چوٹ سی لگتی ہے اور آنکھوں میں آنسو آتے ہیں کہ ویسٹ منسٹر کا گرجا بموں

سے مسمار کیا جائے گا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اگر انگلستان برباد ہوگا تو زندہ رہنے سے کیا فائدہ ! گاندھی جی کا بس چلتا تو وہ کانگریس اور اس کے دوسرے لیڈروں کو بھی اسی راہ پر لگاتے۔۔ لیکن جب ان سے ایسا نہ ہوسکا تو انہوں نے کم از کم اتنا تو کرادیا کہ کانگریس جنگ کے دوران میں برطانیہ کو پریشان نہ کرے۔ لیکن گاندھی جی کے دل کی یہ حالت برقرار نہ رہی۔ ادھر سے جنگ سامراجی سے عوامی بن گئی۔ اور ادھر سے ہمارے مہاتما جی بھی روز بروز بدلتے گئے۔ اور بدقسمتی سے بگڑتے گئے۔ حتی کہ آخر کار گذشتہ دنوں "پریشان نہ کرنے والی" پالیسی کے بجائے برطانیہ کے خلاف بقول ان کے "کھلی بغاوت کا اعلان" کرتے ہوئے کہا کہ یا تو ہندوستان کو ابھی اور اسی وقت سوراجیہ ملنا چاہیے یا اس کو حاصل کرنے کے لئے عوامی تحریک شروع کی جائے گی۔ چاہے اس کا نتیجہ نراج' انارکی یا خلفشار ہی کیوں نہ ہو۔ زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ جہاں گاندھی جی نے "پریشان نہ کرنے والی" پالیسی پر چلنے کا اس وقت مشورہ دیا جب تک جنگ غیر یقینی مرحلے پر تھی۔ لیکن جب اس نے عوامی رنگ اختیار کیا تو آپ نے "کھلی بغاوت" کا اعلان فرمادیا۔ اور یہ کھلی بغاوت سرمایہ داری یا فاشزم کے خلاف نہیں بلکہ دنیا کے جمہوری محاذ یا (اتحادیوں) کے خلاف ہے مہاتماجی کی طبیعت اور خیالات میں تبدیلی آجانے کی تاریخ حد درجہ مایوس کن ہے۔ اور یقین نہیں آتا کہ کیا یہ وہی نیتا ہیں جن کو کروڑوں لوگ بیس سال سے برابر اپنا گرو پیغامبر اور راہنما مانتے آئے ہیں۔ گاندھی جی نے اس دوران میں جو حیرت انگیز حرکتیں کیں ان کو تفصیل کے ساتھ یہاں درج کرنا ممکن نہیں۔ لیکن چند اہم باتوں پر سرسری طور پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔

مہاتما جی کہتے آئے تھے کہ سوراجیہ حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہندو مسلم اتحاد ہو۔ انہوں نے اس اتحاد کو اپنی زندگی کا ایک مقصد بنا رکھا تھا۔ اور رکھتے تھے کہ یہ ان کے سیاسی پروگرام کے چار ستونوں میں سے ایک اور سب سے اہم ستون ہے۔ وہ فرماتے تھے ہندو مسلم اتحاد کے بغیر ہندوستان آزاد نہیں ہوسکتا۔ لیکن آج یک لخت انہوں نے اعلان کردیا کہ سوراجیہ کے لئے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت نہیں۔ یہ اتحاد آزادی کے بعد حاصل ہوسکے گا۔ وجہ انہوں نے یہ بتائی کہ جب تک ملک میں تیسری طاقت موجود ہے ہندو مسلم آپس میں شیر و شکر ہو نہیں سکتے۔" گویا آج تک ہندوستان میں تیسری طاقت موجود نہ تھی اور یہ ابھی ابھی پیدا ہوئی ہے اسی لئے گاندھی جی کا نقطہ نظر بدل گیا ہے۔

گاندھی جی نے ہندوستان میں اس سے قبل دو دفعہ عوامی تحریکیں چلائیں۔ ۱۹۲۲ء میں عدم تعاون کی تحریک چلی۔ اس وقت ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے تھے گو جذباتی طور پر ہی صحیح لیکن تھے ضرور۔ دوسری ۱۹۳۰ء میں سول نافرمانی کی تحریک۔ اس وقت بھی مسلمانوں کی کافی تعداد نے ستیہ آگرہ میں حصہ لیا۔ اور بارہ ہزار کے قریب مسلمان جیلوں میں چلے گئے۔ لیکن آج حالت یہ ہے کہ مسلمان کانگریس سے علیحدہ ہیں۔ قومی تحریک سے الگ تھلگ ہیں۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہندو اور مسلمان گزشتہ چھ صدیوں کے اندر اس قدر ایک دوسرے سے جدا کبھی نہیں ہوئے تھے جتنے آج ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ کچھ ہی ہو اس پر اختلاف رائے ہو سکتا ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ حقیقت یہی ہے مہاتما جی اس سے آنکھیں بند کر رہے ہیں۔ کیوں؟ صرف اس لئے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ہندو مسلم اتحاد کرانے میں وہ ناکام ہوئے۔ مہاتما جی کے پیروؤں کے لئے ان کا نیا نعرہ قابل قبول ہو سکتا ہے لیکن حقیقت شناس اور عاقبت اندیش محبان وطن اچھی طرح دیکھ رہے ہیں کہ یہ ان کی شکست خوردہ ذہنیت کا صاف نتیجہ ہے اور ہماری سماج کی ایسی اندرونی حالت آزادی کی لڑائی کے لئے تسلی بخش نہیں بلکہ خطرناک ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد نو کروڑ سے زیادہ ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ ان کو ناراض رکھ کر ان کے بغیر ہی کوئی عوامی تحریک چلائی جا سکے۔ قومی رہنماؤں اور خصوصاً" مہاتما جی کا فرض تھا کہ وہ سب سے پہلے ان کو منواتے اور قومی تحریک میں شامل ہونے پر رضامند کراتے۔ نہ کہ ان کو نظر انداز کر کے کوئی عوامی تحریک چلاتے۔ ہمارے لئے یہ جواب اطمینان بخش نہیں کہ کانگریسی رہنماؤں نے کوشش کی تھی۔ ایمان دارانہ کوشش کی تھی۔ لیکن مسلم رہنما اپنی ضد پر اڑے رہے اور مسئلہ حل نہ ہو سکا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ غلط ہے کہ اس مسئلے کا حل نہ ہونے کی وجہ صرف مسلم رہنماؤں کی ہٹ دھرمی ہے۔ اگر مہاتما جی اور کانگریسی لیڈروں کا طریق کار درست ہوتا تو مسلم عوام اپنے موجودہ لیڈروں سے ضرور برگشتہ ہو جاتے۔ اور ان کی جگہ نئے رہنما اختیار کر لیتے۔ ہمارا پختہ یقین ہے کہ مسلم لیڈر غلطی کر سکتے ہیں۔ لیکن مسلم عوام غلطی نہیں کر سکتے چونکہ مہاتما گاندھی اور کانگریس کی انتہائی کوششوں کے باوجود" مسلم عوام مسلم لیڈروں سے چمٹے ہوئے ہیں اور اپنے انتخاب کو درست مانتے ہیں۔ اس لئے صاف ہے کہ کانگریس کا طریق کار درست نہیں

اور اس میں کسی جگہ ضرور نقص ہے۔

وہ نقص ہماری رائے میں یہ ہے کہ مہاتما جی نے سیاسیات میں تصوف (Mysticism) اور الہیات (Metaphysics) کو دھر گھسیٹا ہے۔ جس سے ہماری آزادی کی تحریک پر مذہبی رنگ چڑھ گیا ہے۔ سیاسی اور اقتصادی مسائل کو روحانی تجربہ کاری کے سپرد کردیا گیا ہے۔ کانگریس جمہور کے انقلابی پروگرام کو عمل میں لانے کا آلہ نہیں رہی ہے۔ بلکہ ایک ہندو آشرم سا بن گئی ہے جس میں "روحانیت" کا درس دیا جارہا ہے۔ عوام کی غلامی اور پیٹ کا خیال بہت کم رکھا جاتا ہے۔ ہمیں یہ دیکھ کر تعجب نہیں ہوتا کہ مسلمان ان حالات میں سیاسی تحریک اور کانگریس سے دور ہوگئے ہی۔ اور روز بروز زیادہ دور ہوتے جارہے ہیں۔ گاندھی جی چالیس کروڑ ہندوستانیوں کی متحدہ قوت پر بھروسہ کرنے کی بجائے معجزوں پر امیدیں لگائے بیٹھے ہیں حالانکہ آج تک وہ کوئی معجزہ رونما نہ کرسکے۔ اور نہ کرسکتے ہیں۔ انہوں نے بار بار کھلے الفاظ میں بتایا ہے کہ وہ "اپنی اندرونی آواز" کے اشاروں پر چلتے ہیں جمہور کی رائے پر نہیں۔

یہ تو ہوا ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے مہاتما جی نے گذشتہ دنوں اعلان کیا کہ یا تو انگریز ہندوستان سے چلا جائے ورنہ اس کے خلاف ستیہ گرہ شروع کیا جائے گا۔ گو اس کا نتیجہ ملک میں افراتفری یا خلفشار ہو۔ ان کی رائے میں موجودہ حالت کو اب زیادہ دیر کے لئے برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ وہ لوگ جو مہاتما جی کے اُبدیشوں اور خیالوں کو توجہ اور غور کے ساتھ سنتے رہے ہیں اس بات پر بہت دیر تک یقین بھی نہیں کرسکتے کہ یہ ان کے الفاظ ہوسکتے ہیں۔ کیا یہ وہی مہاتما جی نہیں جنہوں نے بنگال کے انارکسٹوں کے خلاف پروپیگنڈا مسلسل جاری کیا تھا۔ اور کہا تھا کہ اگر خلفشار کے ذریعہ سے ہی ہندوستان کو آزادی ملے گی تو اس کے ساتھ ان کا کوئی سروکار نہ ہوگا۔ مہاتماجی نے ایک طرح سے حکومت کو مدد بھی دی تھی کہ انارکسٹوں کو چن چن کر قید میں ڈال دے۔ ان کا قصور کیا تھا۔ یہی کہ وہ بھی برطانوی سامراج کو برداشت نہ کرسکتے تھے۔ اور سمجھتے تھے کہ اس سے بہتر نیراج (انارکی) ہے۔ گاندھی جی بھی آج یہی کہہ رہے ہیں۔ لیکن یہ گاندھی جی ہیں اور وہ انارکسٹ تھے۔ اس لئے یہ قابل پرستش ہیں ار وہ لائق گردن زدنی تھے۔ اور اسی لئے گاندھی جی کو حق بھی ہے کہ وہ ملک کو انارکی کے حوالے بھی کریں۔ (جیسا کہ دو ہفتوں سے

وطن ہو بھی ہو گیا ہے۔) اگر انارکسٹ ایسی حرکت کریں بھی تو سماج اور حکومت دونوں کی نظروں میں ذلیل ہوں۔ یہ کہنا شاید ضروری نہیں کہ ہم انارکی کہ خلاف ہیں۔ چاہے وہ انارکسٹوں کی پھیلائی ہوئی ہو یا گاندھی جی کی۔

مہاتما گاندھی نے ہندوستان کے جمہور کو بیدار کیا۔۔ ہمارے ملک کی تحریک آزادی نے اب انہیں بیس سال سے زیادہ عرصہ سے اپنا رہنما مان رکھا ہے اس لئے وہ قابل احترام ہیں اور ان کے لئے ہمارے دل میں بڑی عزت ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر وہ ایسی حرکت کریں جس سے ملک کو خطرہ ہو اور وطن آزادی کی طرف جانے کی بجائے غلامی کے گڑھے میں جائے تو ہم ان سے یہ کہنے سے جھجکیں کہ "گاندھی جی آپ ہمیں غلط راستے پر لگا رہے ہیں۔" ہم سمجھتے ہیں کہ گاندھی جی کا فلسفہ ۔ ان کا سیاسی اور اقتصادی پروگرام ہندوستان کے کام کا نہیں۔ اسی لئے یہ کارگر نہیں ہوتا۔ اور اب اس کے استعمال سے بھلائی ہونے کے بدلے برائی ہو رہی ہے۔ نفع کے بدلے نقصان ہو رہا ہے۔ ہماری رائے میں گاندھی جی کو بھی دانستہ طور پر یا نادانستہ طور پر اس حقیقت کا احساس ہو رہا ہے اور وہ اب بے صبر اور مایوس ہو رہے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس حالت پر پہنچ کر انہوں نے اپنے اہنسا کے اصول کے ساتھ بھی سمجھوتہ کرنے کا فیصلہ کیا معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے گزشتہ دنوں یہ عجیب تجویز کی کہ ہندوستان کی حفاظت کے لئے تشدد اور عدم تشدد دونوں کو بیک وقت استعمال میں لایا جاسکتا ہے۔

بین الاقوامی سرمایہ داری اور سامراج کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کے لئے ہم اہنسا کے اصول کے قائل نہیں۔ موجودہ سماج کی اقتصادی اور سیاسی عمارت کو اچھی طرح جاننے والا کوئی بھی انسان اس کا قائل نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ وہ سرمایہ داری کا آلہ کار بننے کا فیصلہ نہ کر چکا ہو۔ اہنسا کا اصول ناقابل عمل بھی ہے۔

گاندھی جی نے ہندوستان میں بیس سال سے زیادہ عرصہ سے سب سے بڑے رہنما کی حیثیت سے عدم تشدد کا پرچار کیا۔ پھر بھی سردار دلبھ بھائی پٹیل اور بابو راجندر پرشاد جیسے ان کے قریبی رفقاء کئی دفعہ صاف اعتراف کر چکے ہیں کہ وہ بھی اس امتحان میں پورے نہیں اترے جب یہ ان بزرگوں کا حال ہے تو عام جس قدر بھی عدم تشدد سے ناواقف رہے ہوں کم ہے اور یہ امر حیران کن بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں اس وقت ایسی

افراتفری مچ گئی ہے جس کو دیکھ کر بمبئی کے مشہور قوم پرست اخبار سینٹی نل نے لکھا تھا کہ کانگریس کی یہ جنگ حکومت کے خلاف نہیں عوام کے خلاف ہے۔ گاندھی جی کے بھگت اس غنڈہ گردی میں شامل ہیں اور ایمانداری کے ساتھ یقین کرتے ہیں کہ وہ تحریک کو تقویت دے رہے ہیں۔ گاندھی جی کی مدد کر رہے ہیں۔ اگر گاندھی جی کے اہنسا پرچار اور ڈسپلن یا ضبط کا یہی نتیجہ ہوسکتا ہے تو اس اہنسا کا کیا کہا جائے؟

اس سلسلے میں ہم یہ بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہم حکومت ہند کی موجودہ دباؤ اور استبداد کی پالیسی کو جس میں عوام پر اندھا دھند سختیاں ہو رہی ہیں۔ اور جس میں معصوم اور گنہگار کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا جارہا ہے بنظر نفرت دیکھتے ہیں۔ ہماری رائے میں یہ طرز عمل کانگریس کے رویہ سے کسی قدر کم ضرر ساں نہیں۔ کیونکہ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستانیوں اور حکومت برطانیہ کے درمیان عداوت کے جذبات کم ہونے کے بجائے زیادہ ہوں گے۔ اور جنگی سرگرمیوں میں سخت رکاوٹ پیدا ہوگی۔ جمہوریت پرستوں کا محاذ کمزور ہوجائے گا۔ حکومت ہند کو چاہیے کہ عوام کو مطمئن کرے۔

کانگریس کے دبانے کے بعد معاملہ ختم نہیں ہوسکتا۔ حکومت ہند کو ایسا رویہ اختیار کرنا چاہئے جس سے محبان وطن جان لیں کہ یہ جنگ سامراج کی جنگ نہیں عوام کی جنگ ہے اور اگر اس میں اتحادیوں کی جیت ہوئی تو ہندوستان کا آزاد ہونا یقینی ہے۔

گاندھی جی کا فلسفہ حیات مذہبیات پر مبنی ہے۔ ان کے سیاسی اور اقتصادی نظریوں کی بنیاد بھی مذہب پر ہی کھڑی ہے۔ جب تک انہوں نے ان کو جذباتی قوم پرستی کے دائرے کے اندر چلایا ہندوستان میں انقلاب پیدا کرنے کا موجب بن گئیں۔ لیکن موجودہ جنگ کی وجہ سے تمام قوموں کی آزادی کا مسئلہ بین الاقوامی بن گیا ہے۔ یہ قومیت اور وطنیت کے دائروں کے اندر محدود نہیں رہا۔ پھر جب مہاتما جی نے ان حالات کے اندر اپنے نظریوں کو بین الاقوامی مسائل پر عائد کرنا چاہا تو ان کو دکھائی دیا کہ وہ اشتراکیت اور جمہوریت کے بدلے فاشزم کے نزدیک ہیں۔ فاشزم کی طرح گاندھیت بھی شخصیتی۔ حکمرانوں اور سرمایہ داروں کی حفاظت اپنے ذمہ لیتا ہے۔ مذہب کے نام پر جمہور کو دبائے رکھنا چاہتا ہے تاکہ بالائی ں کو کوئی نقصان نہ پہونچے۔ نازی ازم کرپ۔ تھائسن اور واگلر جیسے سرمایہ داروں کی کے لئے پیدا ہوا ہے تو گاندھی ازم برلا۔ ڈلمیا اور ٹاٹا جیسے سرمایہ داروں کے لئے لڑرہا

ہے۔ دونوں کسی نادیدنی قوت کا خوف دلا کر کسی معجزہ گرفیو ہریا مہاتما کی اندھی پیروی کی تلقین کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ فاشزم تشدد کا پرچارک ہے اور گاندھی ازم عدم تشدد پر یقین رکھنے کا دعوی کرتا ہے لیکن بغور دیکھا جائے تو گاندھی جی کا عدم تشدد عمل میں برترین تشدد سے کم نہیں کیونکہ اس کے ذریعہ "قومی تحریک" غریبوں کو شانت رکھنے اور امیروں کو تشدد سے مزدوروں کو لوٹنے کا موقعہ دینے کے سوا کچھ نہیں کرسکتی۔ اس کے خلاف گاندھی ازم اور سوشلزم یا حقیقی جمہوریت میں کوئی بات مشترکہ نہیں۔ ایک کا سیاسی نظریہ سربسرمذہب پر استادہ ہے۔ لیکن دوسرا مذہب کو سیاسیات سے بالکل الگ کردیتا ہے۔ پہلا سرمایہ دار اور مزدور کے طبقوں کو بدستور برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ دوسرا ان طبقوں کو بیخ و بن سے اڑا کر حقیقی مساوات قائم کرنے کا مدعی ہے۔ پہلا غربت۔ تنگ دستی اور مفلسی کو نعمت خدا مانتا ہے۔ مشین اور کارخانجات کی وسعت کو لعنت قرار دیتا ہے تو دوسرا غریبی اور مفلوک الحالی کو کارخانوں کے قیام سے نیست و نابود کرنے کا تہیہ کئے ہوئے ہیں۔ گاندھیت ذاتی جائداد کے حق میں ہے لیکن اشتراکیت اس کو مٹانا چاہتی ہے۔

لہٰذا گاندھی جی زبانی کچھ بھی کہیں' اپنے فلسفہ حیات اور سیاسی و اقتصادی پروگرام کی وجہ سے وہ فاشزم کو نیست و نابود نہیں کرنا چاہتے۔ کوئی تعجب بھی نہیں کہ وہ فاشزم کو برتر سمجھتے ہوں۔ اور بقول پنڈت جواہر لال ان کے دماغ پر مسلط ہوچکا ہے کہ اس جنگ میں جاپان جیت جائے گا اسی لئے انہوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ اگر انہیں موقعہ ملے تو وہ برطانیہ سے آزادی حاصل کرکے جاپان کے ساتھ سمجھوتہ کرلیں گے۔ اس بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بھی کہ کیا اب دنیا کا کوئی ملک خاص کر جو ہندوستان کی طرح نہتا اور بے بس ہو فاتح فاشسٹ درندوں سے بچ سکتا ہے؟ مہاتما جی نے یہ نہ سوچا کہ آزاد ہندوستان پر دنیا کی آزادی کو برقرار رکھنے کا فرض بھی عائد ہوتا ہے اور ہمیں ظالموں کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کا خیال تک بھی دل میں نہ لانا چاہیے۔ ہندوستان کی موجودہ افراتفری کسی کو فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔۔ اس سے سراسر نقصان ہوگا۔ انفرادی بھی اور قومی بھی یہ تحریک دوسری کوئی بات ثابت کرتی ہو یا نہ کرتی ہو لیکن اتنا ضرور ثابت ہوگیا کہ گاندھیت اندر سے بالکل کھوکھلی ہے۔ اور اس کے ہتھیار ستیہ اور اہنسا اقتصادی اور سیاسی جدوجہد میں غلام قوموں کے لئے بالکل بے کار ہیں۔ گاندھی جی کے بیس سال کے پرچار کے باوجود ہندوستانی عوام نے بھی اب اس کو ایسا

ہی سمجھ رکھا ہے۔

ہمیں حیرانی ہوتی ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو گاندھی جی کی ان محیرالعقول اور حیران کن باتوں کے ساتھ کس طرح متفق ہوتے ہیں۔ اور ان پر عمل بھی کرتے ہیں؟ کیونکہ اس میں شک کرنے کی رتی بھر میں گنجائش نہیں کہ وہ فاشزم کے سخت اور کٹر دشمن ہیں۔ دل سے اس سے نفرت کرتے ہیں اور شاید اس دنیا میں زندہ رہنا بھی پسند نہ کریں۔ اگر جنگ میں فاشزم کی جیت ہو اور جمہوریت پرست عناصر معدوم ہو جائیں۔ ممکن ہے کہ جواہر لال جی نے مصلحتاً گاندھی جی کی قیادت کو قبول کر رکھا ہو۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ گاندھی جی کے بعد پنڈت جواہر لال کے طریق کار کو دیکھ کر ہندوستانی دل سے فاشسٹ ہو چکے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ فاشسٹوں کی حمایت کرنا اور ان کو خوش آمدید کہنا ہی پنڈت جی کی سچی پیروی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ پنڈت جی کی ڈپلومیسی یا مصلحت کا افسوس ناک انجام ہے۔

اگر ہندوستان صرف گاندھی جی کے بھگتوں اور پیرووں سے ہی بھرپور ہوتا تو حالات سچ مچ انتہائی طور پر یاس انگیز اور حوصلہ شکن تھے۔ لیکن شکر ہے کہ ایسا نہیں۔ ملک میں دوسری پارٹیاں موجود ہیں جو عاقبت اندیشانہ طریق کار اور طرز عمل کی موید ہیں۔ ہم ایسی غیر کانگریسی پارٹیوں کا علیحدہ علیحدہ ذکر کرنا غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہے کہ اس نازک دور میں کانگریس کے اندر بھی اشتراکیت پسندوں نے گاندھی جی کی شکست خوردہ ذہنیت اور بے نتیجہ پالیسی کے باوجود ایسا رویہ اختیار کر رکھا ہے جو حقیقی معنوں میں حوصلہ افزاء اور حریت پرستانہ ہے اور ملک کو یقینی طور پر آزادی کی طرف لے جائے گا۔ یہ لوگ صاف دیکھ رہے ہیں کہ ہندوستان کی آزادی ملک کی اندرونی تحریک تک محدود نہیں رہی بلکہ اس جنگ کے نتائج کے ساتھ وابستہ ہے۔ جنگ میں اتحادی جیت گئے تو ہندوستان آزاد ہوگا۔ فاشسٹ جیت گئے تو دنیا کی آزادی کے ساتھ ہندوستان کی آزادی کا بھی خاتمہ سمجھ لیجیے۔ ہندوستان کے اشتراکیت پسند گاندھی جی یا کسی اور لیڈر سے کم قوم پرست نہیں۔ لیکن وہ جانتے ہیں کہ غلام قوموں کی قوم پرستی جو ہمیشہ انقلاب پسند اور ترقی پرور ہونی چاہیے۔ موجودہ بین الاقوامی حالات کے ظہور پذیر ہونے پر رجعت پسند بن سکتی ہے۔ اسی لئے اس کے ساتھ چمٹے رہنا حد درجہ خطرناک ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہی راستہ صحیح ہے۔ جو قومی آزادی کا ہے۔ آج گاندھی جی اور ان کے پیرو اس کو نہیں دیکھ سکتے۔ لیکن وقت آرہا

ہے جب انہیں اس کا احساس ہو گا اگر آج گاندھی بھگتوں میں سے اس حقیقت کو شری یت
راج گوپال آچاریہ اور ان کے چند رفقاء ہی پہچان رہے ہیں وقت گزرنے پر لاکھوں اور
کروڑوں لوگ راجہ جی کے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔

کشمیر کے سوشلسٹوں یا اشتراکیوں کے سامنے سب سے بڑا سوال ہندوستان کی آزادی کا
ہے بین الاقوامی حالات کے متعلق بھی وہ اپنا نظریہ اس سوال کو مد نظر رکھ کر بنا چکے ہیں۔
لیکن یہ آزادی گاندھیت کے کارخانے کی بنی ہوئی آزادی نہیں جس میں شخصی حکومت کے
لئے بھی جگہ ہوگی اور سرمایہ داروں کو مزدوروں کے چوسنے کے لئے بھی گنجائش رہے گی۔
بلکہ یہ آزادی جمہور کی حقیقی اور اصلی آزادی ہونی چاہیے۔ جو نہ تو برطانوی سامراج کو
برداشت کرسکتی ہے۔ اور نہ جاپانی شہنشاہیت کے ساتھ سمجھوتہ کرسکتی ہے جس میں نہ تو رام
راج کے لئے کوئی جگہ ہے اور نہ ہندو راج یا مسلم راج کے لئے۔ بلکہ صرف اور خالص
عوامی راج کے لئے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی آزادی ہندو یا مسلمان علیحدہ طور پر حاصل
نہیں کرسکتے۔ بلکہ ہندوستان کی تمام جنتا مل کر ہی برطانوی سامراج کی گرفت سے نکال سکتی
ہے۔ کیونکہ تبھی یہ ہوسکتا ہے کہ آزادی حاصل کرنے کے لئے ہندوستان کے مختلف فرقے
ایک دوسرے پر اعتماد کرکے امن چین سے بیٹھیں۔ اور اس آزادی کی حفاظت کرسکیں۔
ہمارے دماغ میں جس آزادی کا تصور ہے اس میں کسی اقلیت کو دبایا نہیں جاسکتا بلکہ ہر ایک
کو مکمل "آتم نرنے" یا ذاتی ارادیت کا حق حاصل ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی آزادی
موجودہ دنیا میں ہندوستان کو نصیب نہیں ہوسکتی۔ جب تک فاشزم کا ستیا ناس نہ ہو۔ اگر
فاشسٹوں کو جنگ میں فتح حاصل ہوئی تو ہندوستان ہمارے تصور کی آزادی یعنی حقیقی آزادی کو
حاصل نہیں کرسکے گا۔ گاندھی جی کے تصور کی یا دوسرے کسی قسم کی آزادی حاصل کرے یا
نہ کرے اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔

ان حالات کو مد نظر رکھ کر کشمیر سوشلسٹ پارٹی کی پختہ اور قطعی رائے ہے کہ ہندوستان
کے تمام محبان وطن اور حقیقی جمہوریت پرستوں کا فرض ہے کہ وہ جذبات کو قابو میں رکھ کر
حتی الامکان پوری کوشش کریں کہ جنگ میں فاشسٹوں کی ہار ہو۔ اگر ہم اس مقصد میں
کامیاب ہوئے تو دنیا کے جمہوریت پرستوں اور اشتراکیت پسندوں کو تقویت حاصل ہوگی جس
سے ہماری تحریک آزادی کی راہ میں سہولتیں پیدا ہو جائیں گی۔ اور ہم اپنے نصب العین کے

بہت نزدیک پہنچ جائیں گے۔ ہم موجودہ برطانوی حکومت کو سوشلسٹ حکومت نہیں مانتے۔ اور جو لوگ ایسا خیال کرتے ہیں غلطی پر ہیں۔ برطانوی حکومت ابھی تک سامراجی حکومت ہے۔ لیکن برطانوی سماج میں انقلاب آرہا ہے حقیقت شناس دیکھ رہے ہیں کہ پچھلے تین سال کے دوران میں اس کی حالت کہاں سے کہاں تک پہنچ گئی۔ برطانیہ کے جمہور بیدار ہوگئے ہیں۔ اور وہاں کے بالائی طبقوں کو نیچے گرانے میں مصروف کار ہیں۔ بالائی طبقوں کے لئے اس وقت نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن ہے۔ ان میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جن کا بس چلتا تو وہ ہٹلر سے سمجھوتہ کرکے انگلستان میں بھی فاشسٹ حکومت قائم کرکے جمہوریت پرست عناصر کا قلع قمع کرتے لیکن بالائی طبقوں کے لیڈر دیکھ رہے ہیں کہ اگر انہوں نے کوئی ایسی حرکت کی تو انگلستان میں کھلی بغاوت ہوگی۔ اور وہ انقلاب جس کا انہیں ڈر لگ رہا ہے کامیاب ہوجائے گا۔ اس لئے وہ موجودہ حالت ہی کو طوالت دینا چاہتے ہیں۔ اگر بین الاقوامی جنگ میں فاشسٹ کامیاب ہوگئے تو یہ بالائی طبقے انگلستان میں اپنی ڈکٹیٹرشپ یا استبدادیت قائم کرلیں گے اور وہاں فاشسٹ راج ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت حال ہماری تحریک کے لئے تباہ کن ہوگی۔

ہم نہیں مانتے کہ ہندوستان کو برطانوی سامراج یا کوئی بھی دوسری طاقت آزاد کرے گی۔ ہندوستان آزادی حاصل کرسکتا ہے تو اپنی ہی جدوجہد سے لیکن ساتھ ہی ہمیں ایسی حرکت نہ کرنی چاہیے۔ جس سے فاشسٹ فتحیاب ہوں۔ اور ہماری امیدیں خاک میں مل جائیں۔ ہم اتحادیوں کو کمزور کرنے سے اپنے پاؤں پر کلھاڑا مار رہے ہیں۔ ہماری مثال ایسی ہی ہے کہ ہم برطانوی سامراج کو نیست و نابود کرنے کے لئے اپنی آزادی کی امید کو بھی اس کے ساتھ دفنانا چاہتے ہیں۔ ہمارے ملک میں ایسے نوجوانوں کی کمی نہیں جو بحث و مباحثہ میں کمزور ہوجانے کے بعد بہ بانگ دھل کہتے ہیں کہ چاہے جرمن یا جاپان برا ہی ہو اس کی حکومت میں ہمیں غلام بھی رہنا پڑے ۔ لیکن ہمیں برطانوی سامراج سے چھٹکارا ملنا چاہیے۔ برطانوی سامراج سے چھٹنے کی امید قابل مبارک ہے۔ لیکن جاپان یا کسی دوسری بدیشی حکومت کا غلام بن کر رہنے کو پسند کرنا بزدلی اور غداری ہے۔ اس شرمناک ذہنیت کا جس قدر بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔

ہمارا فرض ہے کہ ہم ہندوستانیوں کے دلوں سے موجودہ شکست خوردہ ذہنیت جو

غلط رہنمائی اور غلط پرچار سے پیدا ہوگئی ہے دور کریں۔ ان کی آنکھیں کھول دیں تاکہ وہ دیکھ سکیں کہ فاشٹ درندے انسانی ترقی کے لیے کتنے برے ہیں۔ دماغی الجھن کی وجہ سے ہندوستانی آج کل یہ جانتے ہوئے بھی کہ جاپانیوں سے کسی اچھے سلوک کی امید نہیں کی جاسکتی۔ پھر بھی کہتے رہتے ہیں کہ ہم تبدیلی چاہتے ہیں۔" تبدیلی کیسی؟ آقاؤں کی؟ تف ہے ایسی حالت پر اس قسم کی دلیلیں صاف غلامانہ ذہنیت کی پیدا کردہ ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ اس ذہنیت کا خاتمہ کر ڈالیں اور اس کے بدلے ملک میں حریت پرستی کے خیالات پھیلائیں جن کی بدولت کسی کی غلامی میں رہنا ناقابل برداشت سمجھا جائے چاہے وہ برطانوی سامراج ہو یا جاپانی شاہ پرستی۔ گاندھی نراج ہو یا سرمایہ دارانہ سوراج۔

ہمیں پورا یقین ہے کہ گاندھی جی کی موجودہ تحریک ہندوستانیوں کو اور حقیقی جمہوریت پرستوں کو زک پہنچانے کے سوا کچھ نہ کرسکے گی اور اپنے بیان کردہ مقصد یعنی آزادی ہند کو حاصل کرنے میں ناکام رہے گی۔ اس کے بعد کانگریسی لیڈر اب برطانوی سامراج کے ساتھ سمجھوتہ کرنے پر اتر آئیں گے۔ جس کو آج ہندوستان سے چلے جانے کا مشورہ دیا جارہا ہے۔ کیونکہ گاندھیت دشمنوں کے ساتھ بھی سمجھوتہ کرنے کی قائل ہے۔ سمجھوتے کے دوران میں کوئی نیا "گاندھی اروں پیکٹ" ہوگا اور ہندوستانیوں کی آنکھوں میں دھول ڈالی جائے گی کہ کانگریس نے فتح حاصل کی۔ ہندوستان کو "پورا سوراج" مل گیا۔ جمہور کی آزادی کی تحریک کے ساتھ اس طرح جو بے انصافی ہوگی اس طرف سے لوگوں کا دھیان ہٹایا جائے گا۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ سحر کاری زیادہ دیر تک نہیں چل سکتی۔

ہمیں افسوس ہے کہ گاندھی جی نے ہلاکت کا راستہ دکھا کر ہندوستان کو افراتفری میں ڈال دیا۔۔ اور اندھا دھند دباؤ کی پالیسی پر چل کر برطانوی حکومت نے اس افراتفری میں اضافہ کر دیا ۔ جس سے ہندوستانیوں کی الجھن سلجھ نہ سکی۔ اور اس میں مزید گانٹھیں پڑ گئیں۔ جنتا کی مایوسی بے چینی اور اداسی میں اضافہ ہوا۔۔ ہمارا فرض ہے کہ اس کو دور کریں اور عوام میں مسائل کو سوچنے کی قوت پیدا کریں۔ انہیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا سبق سکھائیں اور آزادی کے لئے اس عالمگیر جنگ میں بہادرانہ حصہ لینے

کا حوصلہ دلائیں۔

ہماری ریاست کی سیاسی جماعتوں نے اس طرف ابھی وہ توجہ نہیں دی ہے جو ان کو دینی چاہیے تھی۔ دشمن ہمارے دروازے پر کھڑا ہے اور اندر آنے کی کوششیں کر رہا ہے۔ لیکن ہم ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ ہم اتنا بھی نہیں کرتے کہ اپنے بھائیوں کو بیدار کریں اور انہیں اپنی حالت اور آنے والے خطرے کا احساس کرائیں۔۔ جموں کے ہندو مسلمان فرقہ وارانہ جھگڑوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اس لئے نہ تو مسلم کانفرنس اور نہ ہندو نوجوان سبھا اس طرف متوجہ ہوئی ہے خوش قسمتی سے کشمیر کی مقتدر سیاسی جماعت۔ نیشنل کانفرنس۔ نے خطرے کو بھانپ لیا اور اپنی جنرل کونسل کے اجلاس میں ۲۰ جولائی کو یہ کہہ کر کشمیریوں کی صحیح رہنمائی کی تھی کہ موجودہ جنگ اب محض شاہ پرست طاقتوں کا تصادم ہی نہیں بلکہ وہ فسطائیت اور رجعت پسندی کے خلاف دنیا بھر کے جمہور کا محاذ ہے کانفرنس نے بجاطور پر فاشزم کو دنیا کا سب سے بڑا دشمن مان لیا۔ اور فیصلہ کیا کہ حکومت برطانیہ اور حکومت کشمیر چاہے کسی نا تسلی بخش پالیسی پر بھی چلتیں "نیشنل کانفرنس کو ایک ذمہ دار جماعت کی حثیت سے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر انتظار نہ کرنا چاہیے۔ اور تماشہ نہ دیکھنا چاہیے بلکہ جمہوریت پرست لوگوں کی صف میں کھڑا ہونا چاہیے۔ اور عالمگیر دشمن۔ فسطائیت۔ کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ ایسی کوششیں نہ کرنا اس بات کا جواب ہوگا کہ دنیا کو غلامی کی آگ میں جھونک دیا جائے۔"

ہمیں اعتراف ہے کہ یہ رہنمائی فی الواقع حریت پرستانہ اور عاقبت اندیشانہ تھی۔ لیکن اب ایسا دکھائی دینے لگا ہے کہ کانگریسی تحریک کی وجہ سے کانفرنسی لیڈروں کے پاؤں بھی لڑکھڑانے لگے ہیں۔ اور کانفرنس ڈگمگا رہی ہے۔ اس کے لیڈروں عقائد اور خیالات میں تزلزل آچکا ہے۔

ان حالات میں کشمیر کے سوشلسٹوں کا کام مشکل ہوجاتا ہے۔ لیکن اس سے ان کے نظریے میں کوئی فرق نہیں آتا۔ کشمیر کے سوشلسٹ اپنا کام سرانجام دینے سے پیچھے نہ ہٹیں گے گوان کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے یہ کام مختصر سا ہی ہوگا لیکن اس کی ہمیں کوئی پرواہ نہیں۔ موجودہ جنگ "ٹوٹل وار" ہے جس میں ہر ایک آدمی جہاں کہیں بھی وہ ہو کچھ نہ کچھ امداد دے سکتا ہے اور حق تو یہ ہے کہ اس لڑائی کے اندر کام

کرنے والا مزدور اور عوام کی ذہنیت کو درست راستہ پر رکھنے والا پرچارک بھی اتنا ہی اہم کام انجام دے رہا ہے جتنا محاذ پر لڑنے والا سپاہی۔ اس لئے ہم اپنا قلیل حصہ پیش کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتے۔

کشمیر کے سوشلسٹ یا اشتراکی تمام ہندوستانیوں کے نام عموماً" اور ریاستی باشندوں کے نام خصوصاً" اپیل کرتے ہیں کہ وہ اتحادیوں کے خلاف مخالفانہ ذہنیت یا غیر جانبدارانہ لاپروائی کو خیرباد کہہ کر پوری قوت کے ساتھ آگے آئیں۔ اور جس سے جس طرح ہوسکے اس ٹوٹل وار یا مکمل جنگ میں جان بوجھ کر حصہ دار بن جائیں۔

(۱۳ ستمبر ۱۹۴۲ء)

نسلی منافرت یا حریت پروری

ہندوستان کی قومی تحریک کی تاریخ کیا ہے؟ برطانوی سامراج سے آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد۔ دنیا میں آج تک کسی سامراج نے کسی غلام قوم کو خود بخود آزاد نہیں کیا۔ یہ آزادی غلام قومیں مضبوط بن کر ہی چھین سکتی ہیں۔ ورنہ وہ ہمیشہ غلامی کی حالت میں پڑی رہتی ہیں۔ اس لئے جب ہندوستانیوں نے برطانوی حکومت سے اپنا پیدائشی حق مانگا سامراجیوں نے نہ صرف انکار کیا بلکہ اپنی گرفت کو مضبوط کرنے کے لئے تشدد سے ان کو دبایا۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت پیدا ہوئی۔ اور ہندوستانی حریت پرور کے دل میں انگریزوں کے خلاف جتنی زیادہ نفرت تھی اتنا ہی اس کو زیادہ قوم پرست مانا جانے لگا۔ جب تک ہماری سیاسی جدوجہد ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان تھی ایسا ہونا برا نہ تھا۔ کیونکہ اس سے ہندوستانی قوم پرستی کو بڑی تقویت حاصل ہوئی تھی۔ اور تحریک حریت میں ترقی ہوئی تھی۔ لیکن اب حالات میں تبدیلی پیدا ہورہی ہے اور یہ نسلی منافرت ہماری آزادی کے لئے خطرناک ہے' یہ تو ظاہر ہے کہ موجودہ عالمگیر جنگ کی وجہ سے ہندوستان کی جدوجہد دنیا کے حریت پرستوں کے محاذ کا ایک جزو بن گئی ہے۔ اس جنگ کے نتیجہ سے یا تو بین الاقوامی سامراج مضبوط ہوجائے گا یا تمام غلام قومیں آزاد ہوجائیں گی۔ اگر فاشسٹوں کو فتح حاصل ہوئی تو یقینی ہے کہ نہ صرف ہندوستان بدستور غلام رہے گا بلکہ دنیا کے تمام حصوں میں رجعت پسندی کا دور شروع ہوگا۔ اور وہ قومیں جو بدیسی غلامی سے آزاد تھیں اور جن کو روس کی طرح حقیقی آزادی یعنی معاشی آزادی بھی حاصل ہوئی تھی۔ وہ بھی ختم ہوجائیں گی اس لئے ہندوستان کے حقیقی حریت پرستوں کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ وہ اپنی تمام طاقتیں اسی لئے صرف کریں کہ اس جنگ میں فاشسٹوں کو شکست ہو۔ فاشسٹوں کی شکست سے ہی برطانوی سامراج کا

کمزور ہونا بھی یقینی ہے۔ ہندوستان کی بدقسمتی سے ہمارے ملک میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو یہ صاف بات نہیں دیکھ سکتے۔ وہ برطانوی سامراج کی گذشتہ تاریخ کو بار بار پیش نظر رکھ کر صرف اسی کے پیچھے مارے مارے پھرتے ہیں۔ اور نہیں دیکھتے کہ اس جنگ کی وجہ سے اب برطانوی سامراج کو ختم کرنے کے لئے فاشسٹوں کا ناش کرنا ضروری ہوگیا ہے۔

ہندوستانی قوم پرستوں یا یوں کہئے کانگریسیوں میں اس وقت دو گروہ پیدا ہوگئے ہیں ایک گروہ کا نظریہ یہ ہے کہ چاہے کچھ بھی ہو انگریزوں کو اس جنگ میں شکست ہونی چاہئے۔ تبھی ہندوستان آزاد ہوگا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انگریزوں کی شکست کا مطلب برطانوی سامراج کا خاتمہ ہے۔ ان لوگوں سے اگر کہا جائے کہ انگریزوں کی شکست کا مطلب ہندوستان پر جاپانیوں کا قبضہ ہوگا تو پہلے پہل یہ لوگ من گھڑت دلیلیں دینے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جاپان کو ہمارے ساتھ ہمدردی ہے۔ وہ کیوں ہندوستان پر قبضہ کرے؟ لیکن جب انہیں دکھایا جاوے کہ موجودہ دنیا میں سامراج حکومت کو کسی پسماندہ غلام قوم کے ساتھ ہمدردی نہیں ہوتی اور اس کا ثبوت جاپان کی چین میں خون ریزیاں ہیں۔ تو وہ صاف کہدیتے ہیں کہ ہندوستان پر جاپان ہی قبضہ کرے۔ ہمیں کوئی عذر نہیں۔ انگریز سے تو آزاد ہوجائیں گے۔ یہ لوگ بحث کے وقت نمائشی طور پر روس اور چین کے ساتھ بڑی ہمدردی ظاہر کرتے رہتے ہیں۔ لیکن ہر وقت بے قراری اور بے تابی کے ساتھ اس خبر کو سننے کے منتظر رہتے ہیں کہ سٹالین گراڈ کو نازیوں نے فتح کیا۔ یہ لوگ رات کو برلن ٹوکیو اور شیگان ریڈیو کی خبریں سن کر چٹخارے لے لیتے ہیں۔ اور ان کو الہام مانتے ہیں۔ آج کل سٹالین گراڈ کے متعلق خبریں سن کر ان لوگوں کو بڑی مایوسی ہوئی ہے۔ اور ان کی امیدوں پر اوس پڑ گئی ہے۔ لیکن پھر بھی یہ لوگ فاشسٹوں کی فتح پر امیدیں لگائے بیٹھے ہیں۔ گاندھی جی کی تحریک شروع ہونے کے وقت ان لوگوں کو پوری امید تھی کہ گڑبڑ ہوجانے کے ساتھ ہی جاپان ہندوستان پر حملہ کرے گا اور اس کو اپنے قبضہ میں لے لیگا۔ ہر صبح و شام یہ لوگ ریڈیو پر ایسی ہی کسی خبر کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ ان کی بدقسمتی اور ہندوستان کی خوش قسمتی سے ان کی یہ امید بھی بر نہ آئی۔ یہ لوگ اپنے آپ کو گاندھی جی کے سچے

بھگت کہلاتے ہیں اور قوم پرستی۔ حریت پرستی اور وطن پرستی میں اپنے آپ کو اجارہ دار سمجھ بیٹھے ہیں۔ جب کبھی ایسے لوگوں سے پوچھا جائے کہ وطن کو جان بوجھ کر جاپان یا جرمنی کے حوالے کرنا نہ تو حریت پرستی ہے نہ قوم پرستی۔ بلکہ شرمناک غداری ہے تو یہ لوگ انگریزوں کو دو چار گالیاں سنا کر کہدیتے ہیں کہ چاہے ہندوستان کا مستقبل کچھ ہی ہو، ہم انگریزوں سے آزادی چاہتے ہیں اور جو کوئی انگریزوں کو شکست دے۔ ہم اس کے طرفدار ہیں۔ یعنی دوسرے معنوں میں اس کے غلام رہنا پسند کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو پورا اطمینان ہے کہ جو آدمی انگریز کے خلاف زیادہ زور زور سے گالیاں دیتا رہے وہ بڑا وطن پرست اور حریت پرور ہے۔

ہم اس نظریے کو حریت پرورانہ نہیں بلکہ نسلی منافرت کا نظریہ سمجھتے ہیں۔ اس سے ہندوستان آزادی حاصل نہیں کر سکتا۔ بلکہ بدترین غلامی میں پھنس سکتا ہے اور اپنے ساتھ ہی چین، روس اور دوسرے کئی ملکوں کو غلام بنانے کا موجب بن سکتا ہے۔

ہم نے اوپر لکھا کہ برطانوی سامراج کے دو سو سالہ ظلم نے ہندوستانی عوام کی ذہنیت ٹھوس وجوہات کی بناء پر انگریز قوم کے خلاف بنادی ہے۔ اس لئے اس گروہ کے لوگ آسانی کے ساتھ ہندوستانیوں میں اپنا نظریہ قابل قبول بنا سکتے ہیں۔ یہ نظریہ کامیاب تو ہرگز نہیں ہو سکتا۔ لیکن کچھ مدت کے لئے موجودہ بین الاقوامی انقلاب کی کامیابی کی راہ میں دقتیں پیدا کر سکتا ہے۔ کیونکہ اس نظریے کی بدولت ہندوستانی عوام کی ذہنیت فاشسٹ نواز بن گئی ہے۔ اور وہ نہیں دیکھ سکتے کہ ہماری آزادی کا دارومدار چین اور روس کی فتح پر ہے۔ اس لئے سٹالین گراڈ کے بچاؤ کی ناکامی یا جاپان کی فتح پر ہندوستانیوں کو خوش نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ سوگ کرنا چاہیے۔

قوم پرستوں کے دوسرے گروہ میں ہندوستان کے حقیقت پرست موجود ہیں۔ یہ لوگ برطانوی سامراج کے جدید ترین دشمن ہیں اور جانتے ہیں کہ جب تک یہ موجود ہے۔ ہندوستان آزاد نہیں ہو سکتا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ لوگ جذبات کی رو میں بہ کر درخت کی اس ٹہنی کو نہیں کاٹنا چاہتے جس پر خود کھڑے ہیں۔ ان کے سامنے سب سے اہم سوال ہندوستان کی آزادی کا ہے۔ انگریز کو گالیاں دینے اور قومی منافرت کا جذبہ دل میں رکھنے سے یہ لوگ خوش نہیں ہوتے۔ ان کے سامنے جاپانی سامراج بھی

اتنا ہی برا ہے جتنا برطانوی سامراج۔ اس لئے یہ برطانوی سامراج کو نکالتے وقت جاپانی سامراج کو خوش آمدید نہیں کہنا چاہتے۔ یہ لوگ جانتے ہیں کہ وطن کو آزادی کے لئے لازمی ہے کہ موجودہ جنگ میں اتحادی محاذ مضبوط ہو۔ روس اور چین کو امداد دی جائے۔ زبانی ہی نہیں عمل سے بھی۔ ان لوگوں میں ہندوستان کے سچے سوشلسٹ اور کمیونسٹ شامل ہیں۔ اس گروہ کے آدمیوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں۔ کیونکہ ان کا نظریہ جذباتی نہیں بلکہ حقائق و دلائل سے پختہ ہے۔ یہ قدرتی امر ہے کہ اس گروہ کے آدمیوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو۔ کیونکہ یہی نظریہ انقلاب پسند اور حقیقی قوم پرورانہ ہے اور انجام کار ہردلعزیز ہوجانا یقینی ہے۔ گاندھی جی کی تحریک کی وجہ سے اس نظریے کی کامیابی کی راہ میں دقتیں پیدا ہوگئی ہیں۔ لیکن ہندوستان کی آزادی کی طرف یہی نظریہ لے جاسکتا ہے دوسرا نہیں۔

ہندوستان کے محب وطن لوگوں کا فرض ہے کہ ملک کو غلامانہ نسلی منافرت کے نظریہ سے بچائیں۔ عوام میں حقیقی حریت پروری اور انقلابی قوم پرستی کا نظریہ مقبول بنائیں۔ یہی عاقبت اندیشی ہے اور اسی سے ہم وطن کو آزاد کراسکتے ہیں ورنہ نہیں۔

یکم نومبر ۱۹۴۳ء

امریکیوں کی ہندوستان سے ہمدردی کیوں؟

آج کل امریکہ میں ہندوستان کی تحریک آزادی کے ساتھ بہت ہمدردی کا اظہار کیا جارہا ہے اور امریکہ کے سیاست دان برطانوی حکومت پر دباؤ ڈال رہے ہیں کہ انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ سمجھوتہ کرکے ہندوستان میں نیشنل گورنمنٹ یا قومی حکومت قائم کی جائے۔ چنانچہ آئے دن امریکی پریس میں بیانات شائع ہوتے رہتے ہیں جن میں بتایا جاتا ہے کہ ہندوستان میں تب تک امن قائم نہیں ہوسکتا اور ہندوستان کے لوگ اتحادیوں کو جنگی کاموں میں امداد نہیں دے سکتے جب تک کہ وہاں موجودہ سیاسی اور آئینی تعطل دور نہ کیا جائے۔ اور حکومت کانگریسی لیڈروں کے حوالے نہ کی جائے۔ گذشتہ دنوں مسٹر فشر نے اسی قسم کا ایک سلسلہ مضامین امریکی پریس میں شروع کردیا تھا جس کو ہندوستان میں بھی "قوم پرست" اخبارات نے نقل کرکے کافی اشاعت دی تاکہ دکھایا جاسکے کہ امریکہ کے لوگ ہندوستان میں نیشنل گورنمنٹ قائم کرنا کتنا ضروری سمجھتے ہیں۔ حکومت ہند نے مسٹر فشر کے مضامین کو قابل اعتراض قرار دے کر ان کی اشاعت بند کرادی جس کے بعد نیشنل کانگریس کے حمایتی اخبارات نے یہ کہنا شروع کردیا کہ برطانوی حکومت اس قدر رجعت پسند اور ہندوستان کی آزادی کی مخالف ہے کہ وہ ایسے مضامین کو شائع کرنا بھی برداشت نہیں کرسکتی۔ جن میں نیشنل گورنمنٹ کے حق میں کچھ لکھا گیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی قوم پرست اخبارات نے یہ کہنا شروع کردیا کہ یہ امریکی حضرات بڑے آزاد خیال اور جمہوریت پسند ہیں جو آج کل ہندوستان میں نیشنل گورنمنٹ قائم کئے جانے کے لئے زور دے رہے ہیں۔ ہمیں دیکھنا چاہئے کہ ہندوستان کی آزادی کے حق میں امریکہ کے اندر جو یہ نئی تحریک چل پڑی ہے کیا یہ سچ مچ جمہوریت پرستوں اور آزاد خیال سیاستدانوں کی چلائی ہوئی تحریک ہے یا اس کی پشت پر اور کوئی طاقت کام کررہی ہے؟ یہ سوال اس لئے بھی پیدا ہوتا ہے کیونکہ اس

تحریک کو چلانے والے زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو امریکہ کی ریپبلکن پارٹی کے رکن ہیں۔ امریکہ کے جن اخبارات میں ہندوستان کے حق میں مضامین شائع ہوتے ہیں وہ بھی اس پارٹی کے اخبارات ہیں۔ امریکہ کی ریپبلکن پارٹی وہاں کے سرمایہ داروں کی نمائندہ انجمن ہے۔ اس لئے یہ ایک حیران کن امر ہے کہ جو پارٹی اپنے ملک میں رجعت پسندانہ اقدامات کرنے کی ذمہ دار ہو وہ ایک پسماندہ ملک کی آزادی کے لئے کیوں اتنی بے تاب ہوجائے۔ جتنی کہ ریپبلکن پارٹی ہندوستان کی آزادی کی نسبت دکھائی دیتی ہے؟ جنگ سے قبل اس پارٹی کے کسی مقتدر رکن یا اخبار نے کبھی بھی ہندوستان کی نیشنل گورنمنٹ کے حق میں ایک آدھ دفعہ لب کشائی نہ کی تھی۔ آج یکایک ان امرکی حضرات میں ہندوستان کے ساتھ ہمدردی کیوں کر پیدا ہوئی؟

جنگ سے قبل ہندوستان برطانوی سامراج کے ماتحت تھا۔ یہ تو ہر ایک کو معلوم ہے کہ برطانوی سامراج ہندوستان کو ڈیڑھ سو سال تک اقتصادی طور پر چوستا رہا۔ اور سیاسی طور پر دباتا رہا۔ ہمیں جاننا چاہیئے کہ برطانوی سرمایہ دار ایسا کیونکر کرتے تھے؟ برطانوی سرمایہ داروں نے ہندوستان میں کروڑوں روپیہ لگاکر بڑے بڑے کارخانے قائم کروئے تھے۔ ان کارخانوں میں وہ ہندوستان کی اشیائے خام استعمال کرتے تھے اور لاکھوں ہندوستانیوں کو معمولی اجرت پر لگاکر چیزیں تیار کرواتے تھے۔ ان کارخانوں سے کروڑوں روپیہ کی آمدن تھی۔ جو ان ہی ہندوستانی مزدوروں کی محنت و مشقت کا استحصال کرنے سے پیدا ہوئی تھی۔ برطانوی سرمایہ دار ہر سال یہ کروڑوں روپیہ اپنے وطن کو لے جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ کسی ملک کے سرمایہ داروں کا اس طرح دوسرے ملک سے روپیہ لے جانا لوٹ ہے۔ اسی لوٹ کھسوٹ کو سامراج کہتے ہیں۔ ہندوستانی اس لوٹ کھسوٹ سے بچنے کا علاج کرسکتے تھے۔ وہ برطانوی سرمایہ داروں کے کارخانوں کے مقابلے پر اپنے کارخانے قائم کرسکتے تھے لیکن حکومت ان کے ہاتھ میں نہ تھی۔ وہ برطانوی سرمایہ داروں کے قبضے میں تھی۔ اس لئے وہ اس میں زیادہ کامیاب نہ ہوسکے۔ کیونکہ برطانوی سامراج کی قائم کردہ حکومت نے اپنی طاقت سے انہیں دبایا۔ اور ابھرنے نہ دیا۔ اگر کہیں کسی ہندوستانی سرمایہ دار نے کوئی کارخانہ قائم کربھی دیا تو وہ بھی زیادہ تر برطانوی سرمایہ داروں کے ساتھ تعاون کرنے سے ان کے شرکاء کی حیثیت

میں کیا۔ بہت کم جگہوں پر ہندوستانی سرمایہ داروں نے آزادانہ طور پر اپنے کارخانے قائم کئے۔

یہ حال موجودہ جنگ شروع ہونے تک برابر قائم رہا۔ اس جنگ نے دنیا میں ایک انقلاب پیدا کردیا ہے۔ ہر جگہ اقتصادی اور سیاسی حالات سرعت سے بدل رہے ہیں۔ انسانی سماج میں بے مثل تغیر آرہا ہے۔ سلطنتیں مٹ رہی ہیں۔ انگریزوں پر ۱۹۳۹ء سے لے کر ۱۹۴۲ء تک اپنے وطن میں بڑی مصیبت نازل ہوئی۔ نازیوں نے ان کے کارخانے تباہ کردئے۔ شہروں کے شہر برباد ہوئے۔ اس جنگ میں برطانوی سرمایہ داروں کو بے شمار دولت خرچ کرنی پڑی۔ جنگ کے اخراجات کا قریباً" سارا بار ان ہی کے کندھوں پر پڑا۔ کیونکہ غریب طبقوں نے کوئی نیا ٹیکس ادا کرنے سے انکار کردیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ برطانوی سرمایہ دار مجبور ہوئے کہ اپنا وہ سرمایہ جو انہوں نے ہندوستان کے کارخانوں میں لگا رکھا تھا۔ مجبوراً" فروخت کرڈالیں۔ تازہ ترین اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے ہندوستان کے کارخانے یا تو ہندوستانی سرمایہ داروں کے پاس فروخت کردئے یا امریکی سرمایہ داروں کے پاس۔ برطانوی حکومت نے ادھار اور پٹے کے قانون کے تحت امریکی سرمایہ داروں سے کافی سامان جنگ خرید لیا جس کے عوض انہوں نے ہندوستان کے بہت کارخانے ان کے پاس فروخت کرڈالے۔ گویا اب ہندوستان کے کارخانوں پر ہندوستانی اور امریکی سرمایہ داروں کا قبضہ ہوگیا ہے اور برطانوی سرمایہ داروں کا زیادہ قبضہ نہیں رہا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان برطانوی سامراج سے آزاد ہوگیا۔ لیکن امریکی سامراج کی غلامی میں آرہا ہے۔ اب اقتصادی طور پر امریکہ ہی ہندوستان کو لوٹنا شروع کرے گا۔ اور ہندوستانی سرمایہ دار اس کی اس لوٹ کھسوٹ میں شریک ہوگا۔

اقتصادی طور پر امریکہ کے سرمایہ داروں نے ہندوستان کو جیت لیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ سیاسی قبضہ ابھی برطانیہ کے ہاتھ میں ہے۔ اس کا کیا ہوگا؟ یہی وہ خیال ہے جو امریکی سرمایہ داروں کو ستارہا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح جنگ کے دوران میں ہی ہندوستان کی سیاسیات پر بھی ان ہی کا قبضہ ہوجائے تاکہ انہوں نے برطانوی سرمایہ داروں سے جو کارخانے خرید لئے ہیں۔ ان کی وہ خود پوری طرح حفاظت

کر سکیں۔ موجودہ وقت میں یہ ناممکن ہے کہ امریکہ ہندوستان پر کھلم کھلا قابض ہو۔ انگریزوں نے ہندوستان پر ایک سو پچاس ۱۵۰ سال پہلے قبضہ کرلیا تھا جب کہ دنیا کی سیاسی حالت کچھ اور تھی۔ آج ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے امریکہ کے سرمایہ داروں نے ایک دوسری چال سوچی۔ وہ یہ کہ ہندوستان کو برطانوی حکومت سے آزاد کروایا جائے اور وہاں ایسی حکومت قائم کرنے میں مدد دی جائے جس پر ہندوستانی سرمایہ داروں کا پورا قبضہ ہو۔ ہم نے اوپر بتایا ہے کہ یہ ہندوستانی سرمایہ دار بھی کارخانوں کی ملکیت میں شریک ہیں۔ اس لئے امریکنوں کا بھروسہ ہے کہ اگر حکومت ان ہی کے ہاتھوں میں رہے گی۔ یہ کارخانے محفوظ رہیں گے۔ کیونکہ یہ لوگ کبھی نہ چاہیں گے کہ کارخانوں کو کسی طرح نقصان پہنچے۔ امریکی سرمایہ داروں کو خوف لاحق ہوگیا ہے کہ اس جنگ کی وجہ سے اشتراکی خیالات پھیل رہے ہیں۔ ہندوستان میں بھی سوشلسٹ جماعتیں پیدا ہوگئی ہیں۔ جب جنگ میں روس کی کامیابی ہوگی ان اشتراکی جماعتوں میں نمایاں قوت پیدا ہوگی۔ ان کا اقتدار اور اثر و رسوخ بڑھ جائے گا اس لئے بالکل ممکن ہے کہ جنگ کے بعد ان اشتراکی جماعتوں کی وساطت سے ہندوستان میں جمہوری حکومت قائم ہو۔ اور ایسی حکومت ہندوستان کے کارخانوں پر قبضہ کرکے سرمایہ داروں کو ان کی ملکیت سے محروم کردے۔ اس لئے امریکی سرمایہ دار چاہتے ہیں کہ جنگ ختم ہونے سے پہلے ہی ہندوستان میں ایسی حکومت قائم ہو جس پر ہندوستانی سرمایہ داروں کا پورا پورا قبضہ ہو تاکہ ان سرمایہ داروں کے ذریعہ سے امریکی سامراج مکمل طور پور عمل پذیر ہو۔

ہم نے دیکھ لیا ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس ان ہی ہندوستانی سرمایہ داروں کی جماعت ہے۔ اور وہ بھی اسی قسم کی حکومت قائم کرنے کی خواہاں ہے۔ غرضیکہ امریکہ کی ریپبلکن پارٹی اور ہندوستان کی انڈین نیشنل کانگریس کا اقتصادی پروگرام ایک ہے۔ دونوں ہندوستان میں "نیشنل گورنمنٹ" قائم کرنا چاہتی ہیں تاکہ ہندوستانی اور امریکی سرمایہ داروں کا سرمایہ ہندوستان میں محفوظ رہے۔ لیکن یہ نیشنل گورنمنٹ نام کی نیشنل گورنمنٹ ہوگی اور حقیقت میں ایسے لوگوں کی حکومت ہوگی جن کے پروگرام میں جمہور کی ہمدردی کی کوئی بات نہیں اور جو ظاہرا طور پر نیشنل گورنمنٹ ہندوستان کی "آزادی" "برطانوی سامراج کا خاتمہ" ایسے نعرے بلند کرکے عوام کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں۔

ہندوستان کے جمہور کے لئے جس نیشنل گورنمنٹ کی ضرورت ہے وہ اس قسم کی نہیں جس کا مطالبہ ہندوستانی سرمایہ دار یا امریکی لبرل اور آزاد خیال ریپبلکن لیڈر کر رہے ہیں۔ ہمیں ایسی آزادی کی ضرورت ہے جس میں کوئی سرمایہ دار چاہے وہ برطانوی ہو امریکی ہو یا ہندوستانی ہندوستان کے مزدوروں کی محنت و مشقت کا استحصال نہ کرسکے۔ امریکنوں کی ہمدردی حقیقی ہمدردی نہیں۔ یہ ان کے اپنے اس سرمایہ کے ساتھ ہمدردی ہے جو انہوں نے حال ہی میں برطانوی سرمایہ داروں سے خرید لیا ہے۔

ہندوستان کے جمہوریت پسندوں اور حریت پرستوں کو اس ملک کے سرمایہ داروں کے اخبارات سے گمراہ نہ ہونا چاہیے۔ یہ اخبارات ان لوگوں کے نمائندہ ہیں جنھوں نے امریکی سرمایہ داروں کے ساتھ مل کر برطانوی سرمایہ داروں سے ہندوستان کے کارخانے خرید لئے ہیں۔ اسی لئے یہ لوگ امریکنوں کی آزاد خیالی اور فراخ دلی کی تعریف کرتے ہیں۔ لیکن جہاں تک ہندوستان کے کروڑوں فاقہ کش انسانوں کا تعلق ہے اس آزاد خیالی اور فراخدلی میں نہ آزاد خیالی ہے نہ فراخ دلی بلکہ اس کا مدعا صرف یہ ہے کہ ہندوستان کو جو برطانوی سامراج سے آزاد ہوا ہی چاہتا ہے۔ امریکی سامراج کے حوالے کردیا جائے۔ اس کا مقصد ہرگز ہندوستان کی سچی آزادی نہیں۔

(۲۳ جولائی ۱۹۴۳ء)

ہاں آزادی! لیکن کون سی آزادی

آج کل ہندوستان میں آزادی کا نعرہ ہر طرف سے بلند ہو رہا ہے۔ ہم آزادی چاہتے ہیں اور اس کو حاصل کرنے کے لئے ہم قربانی دینے کے لئے بھی تیار ہیں۔ لیکن ہم میں سے کتنے ایسے لوگ ہیں جنہوں نے اس مسئلہ کو سوچا ہے کہ آزادی کس کو کہتے ہیں؟ آپ کسی ہندوستانی سے پوچھ لیجئے وہ زبردست قوم پرست اور کانگریسی ہی کیوں نہ ہو کہ وہ آزادی کیا ہے جس کے لئے وہ لڑ رہا ہے اور جس کو حاصل کرنے کے لئے وہ زمین و آسمان کے قلابے ملا رہا ہے تو عموماً" آپ کو یہی جواب ملے گا کہ واہ صاحب! اچھا سوال آپ نے پوچھا آزادی کس کو کہتے ہیں؟ یہ تو بہت آسان ہے۔ آزادی کے معنی ہے اپنے وطن کو غیروں کے پنجے سے چھڑانا۔ انگریز نے ہمارے ملک پر قبضہ کر رکھا ہے اور اگر ہم اس کو نکال دیں تو آزادی ہی آزادی ہے"۔ دیکھنا ہے کہ کیا سچ مچ اسی کو آزادی کہا جاسکتا ہے؟ کیا اگر انگریز ہندوستان سے چلا گیا تو اس کے بعد ہندوستان کے چالیس کروڑ لوگ آزاد ہوں گے؟

ہم جانتے ہیں کہ ہندوستان میں جو لوگ آباد ہیں وہ ایک جیسے نہیں۔ اکثر ایسے ہیں جو غریب ہیں۔ شب و روز محنت و مشقت کرتے ہیں لیکن پھر بھی نان شبینہ کو ترس رہے ہیں' ننگے پھرتے ہیں' بھوکے رہتے ہیں۔ چیتھڑے پہنتے ہیں۔ مختلف امراض کا شکار ہوتے ہیں۔ قبل از وقت بوڑھے ہو جاتے ہیں اور مرتے ہیں۔ اس کے برخلاف ہندوستان میں ایسے لوگ بھی زیادہ ہیں جن کی تعداد گو تھوڑی ہے لیکن پھر بھی عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ آرام سے کھاتے ہیں۔ بڑے بڑے عالیشان محلوں میں رہتے ہیں۔ ریشم اور پشمینہ پہنتے ہیں۔ موٹروں کی سیریں کرتے ہیں۔ کوئی محنت و مشقت نہیں کرتے۔ ان لوگوں میں جاگیردار۔ زمیندار۔ چکدار اور سرمایہ دار شامل ہیں یہ لوگ خود تو رنگ رلیاں مناتے رہتے ہیں۔ لیکن دوسرے بے شمار لوگ ان کی زمینوں پر اور ان کے کارخانوں میں کام کر کے ان کے لئے دولت پیدا کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان کام کرنے والے بدقسمت مزدوروں

اوران کے مالکوں۔ کروڑوں کسانوں اور جاگیرداروں کے لئے آزادی کا مفہوم ایک ہی ہے۔ کیا مزدوروں کے لئے بھی اسی آزادی کی ضرورت ہے جس آزادی کی ان کے آقا کو ضرورت ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو صاف پتہ چلے گا کہ جو آزادی مزدور کو خوشحال بنا سکتی ہے وہ آزادی مالک کو خوشحال نہیں بنا سکتی بلکہ وہ اس کے لئے وبال جان ہے۔ مثلاً" کسان جاگیردار کی زمین پر کام کرتا ہے۔ سال بھر محنت و مشقت کرنے کے بعد وہ اس زمین سے اناج پیدا کرتا ہے۔ جب فصل تیار ہوتی ہے جاگیردار اس کا آدھا یا اس سے کم زیادہ حصہ لے جاتا ہے۔ باقی میں سے کچھ حصہ سرکار کو بطور لگان دینا پڑتا ہے اور بہت قلیل حصہ کسان کے لئے رہتا ہے۔ اس سے نہ تو وہ اپنا اور اپنے اہل و عیال کا پیٹ بھر سکتا ہے اور نہ ہی اپنی دوسری ضروریات زندگی پوری کر سکتا ہے۔

جب تک موجودہ اقتصادی اور سیاسی نظام کار فرما ہے کسان کی محنت اور مشقت کا اسی طرح استحصال ہوتا رہے گا۔ اس کو اپنی مشقت کا پورا پھل نہیں ملے گا۔ کیونکہ جاگیردار اور زمیندار اس کی محنت کے پھل کا کثیر حصہ چھینتے رہیں گے۔ لہٰذا کسان کی آزادی کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس سیاسی اور اقتصادی نظام سے آزاد ہو اور اس کے لئے ایسا نیا نظام قائم ہو جائے جس کے اندر رہ کر وہ اپنی پیداوار کا بلا شرکت غیرے مالک ہو۔ کوئی جاگیردار زمیندار نہ ہو جو اس کی محنت و مشقت کا پھل چھین لے۔ لیکن جاگیردار کی آزادی کا مطلب یہ نہیں۔ وہ تو چاہتا ہے کہ موجودہ سماجی اور اقتصادی نظام قائم اور دائم رہے۔ اس میں کوئی خلل واقع نہ ہو بلکہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جائے جاگیردار کی انتہائی کوشش ہوگی کہ موجودہ نظام پر اس کا قبضہ ہو جائے تاکہ وہ اس کو ہر طرح سے محفوظ بنا لے اور اس کو کسی طرح بگڑنے نہ دے۔

پس ظاہر ہے کہ ہندوستان کے تمام لوگوں کی آزادی کا مطلب ایک ہی نہیں۔ غریبوں اور پسماندہ لوگوں کی آزادی کا جو مفہوم ہے وہ امیروں اور بالائی طبقوں کے لوگوں کی آزادی کا مفہوم نہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دونوں طبقوں کی آزادی ایک دوسرے کے منافی ہے۔

آج کل ہندوستان میں آزادی کا نعرہ ہر طرف سے بلند ہو رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ آزادی کس قسم کی ہونی چاہیے؟ انگریز کو نکالا جانا ٹھیک ہے۔ ـــ ـــ ـــ لیکن انگریز کو نکالے

جانے کے بعد کیا ہوگا؟ سوال تو یہی زیادہ اہم ہے۔ اگر انگریز کے نکالے جانے کے بعد ہندوستان میں سیاسی اور اقتصادی نظام وہی قائم رہے گا جو آج کل ہے تو اس آزادی سے عوام کو کیا حاصل۔ اگر انگریز کے چلے جانے کے بعد کسان کو اسی طرح محنت و مشقت کرنی پڑے گی جس طرح آج کل پھر اس محنت کا پھل بالائی طبقوں کے لوگ اسی طرح چھینتے رہیں گے جس طرح آج کل تو کسان کو اس سے کیا غرض کہ انگریز چلا گیا یا ابھی ہندوستان میں موجود ہے۔ ہندوستان کے کانگریسی قوم پرست لیڈر جن کی اکثریت ان ہی جاگیرداروں۔ سرمایہ داروں۔ کارخانہ داروں اور زمینداروں کی ہے آج کل نیشنل گورنمنٹ یعنی قومی حکومت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ بھلے لوگ اس بات کو واضح طور پر نہیں بتاتے کہ نیشنل گورنمنٹ کیسی ہوگی؟ کن کی ہوگی؟ اس کا نصب العین کیا ہوگا؟ انہوں نے صرف ایک بات ورد زبان کر رکھی ہے۔ وہ یہ کہ ہم وطن کو غیروں کے قبضہ سے چھڑانا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں کے ہاتھ میں پروپیگنڈا کے وسیع ذرائع موجود ہیں۔ جن کی بدولت انہوں نے مفلوک الحال اور پسماندہ طبقوں کے لوگوں کی ایک کثیر تعداد کو بھی اپنے اس مطالبہ کے حق میں کر رکھا ہے۔ یہ لوگ دنیا کی آنکھوں میں دھول ڈال رہے ہیں کہ وہ ہندوستان کے جمہور کو آزاد کرنے کے لئے نیشنل گورنمنٹ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ قومی حکومت قائم نہیں کرنا چاہتے بلکہ انگریزوں کے ہاتھ سے حکومت چھین کر اپنے ہاتھوں میں لینا چاہتے ہیں اور اس کو ہی قومی حکومت کہتے ہیں۔ آج تک یہ لوگ قومی حکومت کے لئے اتنے پریشان نہیں تھے نہ انگریزوں کو نکالنے کے لئے اتنے پریشان تھے جتنے اب ہیں۔ کیونکہ آج تک انہیں انگریز سرمایہ داروں کے ساتھ ہندوستانی جمہور کو لوٹنے کے لئے شراکت میسر تھی۔ موجودہ بین الاقوامی بحران نے دنیا میں سماجی انقلاب پیدا کردیا جس سے انگریزوں کے اپنے گھر میں انقلاب آرہا ہے۔ اسی وجہ سے وہ انگریز ہندوستان کو چھوڑنا چاہتے ہیں۔ لیکن جنگ کے دوران میں ایسا نہیں کرنا چاہتے کیونکہ انہیں خطرہ ہے کہ اگر انہوں نے جنگ کے دوران میں ہندوستان کو چھوڑا تو شاید جاپان ہندوستان پر قبضہ کرکے انہیں شکست دے دے۔ لیکن ہندوستانی سرمایہ دار اور جاگیردار بیتاب ہوگئے ہیں وہ دیکھتے ہیں کہ اگر انہیں جلد از جلد ہندوستان کی سیاسیات اور اقتصادیات پر پورا قبضہ نہ ہوگیا تو ممکن ہے کہ موجودہ بین الاقوامی بحران کی وجہ سے ہندوستان میں بھی سماجی اور سیاسی انقلاب آجائے اور ہندوستانی جمہور بیدار

ہو کر ان کا مقابلہ کریں۔ پرانے سیاسی اور اقتصادی نظام کو ختم کردیں اور اس کی جگہ ایسا نیا نظام قائم کر دیں جس سے عوام کی محنت و مشقت کا پھل کوئی چھین نہ سکے۔ یعنی جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے طبقوں کا خاتمہ ہو۔

جنگ کی وجہ سے دنیا میں بڑی سرعت کے ساتھ تبدیلیاں آرہی ہیں۔ ہندوستان کے جاگیردار اور زمیندار اس سے ڈر رہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ انگریز ہندوستان سے چلے جائیں اور ملک کی حکومت ان کے حوالے کردیں تاکہ وہ خود اس بات کی کڑی نگرانی کرسکیں کہ موجودہ سیاسی اور اقتصادی نظام میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا کسی طرح یہ بگڑنے تو نہیں پاتا۔ ظاہر ہے کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد ہندوستانی سرمایہ داراور بالائی طبقے ملک میں فاشسٹ طرز کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ موجودہ نظام تو اتنا بوسیدہ ہوچکا ہے اور بگڑ چکا ہے کہ اس کے زندہ رہنے کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ ہندوستان کے چالیس کروڑ لوگ اس نظام سے تنگ آگئے ہیں۔ صرف یہی سرمایہ دار اور جاگیردار ہیں جو اس کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں لہٰذا ان کی حکومت قائم ہونے پر یہ صورت پیدا ہو گی کہ ہندوستانی جمہور حقیقی قومی حکومت قائم کرنے کے لئے انقلاب بپا کرنا چاہیں گے۔ لیکن ہندوستانی سرمایہ دار، جاگیردار اور دیگر بالائی طبقوں کے لوگ جن کے ہاتھ میں حکومت ہوگی ان کو دبانے کے لئے فوجی حکومت قائم کریں گے ملک میں تشددانہ دور شروع ہوگا۔ اور یہ اس نیشنل گورنمنٹ کی برکات ہوں گی جس کے لئے کانگریسی قوم پرست آج کل تڑپ رہے ہیں۔

اس لئے ہمارے سامنے اس وقت یہی سوال پیش نظر رہنا چاہیے کہ ہم جو آزادی مانگتے ہیں یہ کس قسم کی آزادی ہوگی؟ سرمایہ داروں کی آزادی ہوگی یا ہندوستانی عوام کی آزادی ہوگی؟ کیونکہ ان کی اور ہماری آزادی کا مفہوم جدا جدا ہے۔ وہ جس قومی حکومت کے لئے تڑپ رہے ہیں وہ صحیح قومی حکومت نہیں بلکہ ان کی اپنی حکومت ہے جس کا مدعا ہندوستانی جمہور کو دبانا ہوگا۔ موجودہ بوسیدہ سیاسی اور سماجی نظام کو بدستور قائم رکھنا ہوگا۔ ہمیں برطانوی سامراج سے نفرت ہے۔ انگریزوں کی غلامی سے نفرت ہے۔ ہندوستانی سرمایہ دار نے ہمارے ان وطنی جذبات کا ناجائز فائدہ اٹھا کر ہمیں گمراہ کر رکھا ہے۔ اور ہم سے اسی قسم کی آزادی کا مطالبہ کرا رہا ہے جو اس کی اپنی آزادی ہوگی اور ہماری بربادی اور غلامی۔ کیا ہم اس قسم کی آزادی چاہتے ہیں اور اسی کے لئے لڑنے پر تیار ہو رہے ہیں؟

ہم آزاد ہونا چاہتے ہیں ہم انگریز کو ہندوستان سے نکالنا چاہتے ہیں۔ لیکن پیشتر اس کے کہ ہم ایسا کریں ہمیں جاننا چاہیے کہ جو آزادی آرہی ہے وہ کس قسم کی آزادی ہوگی؟ اگر یہ سرمایہ داروں کی آزادی ہوگی تو ہمیں اس سے کیا حاصل؟ ہمیں جمہور کو موجودہ سیاسی اور اقتصادی غلامی سے نجات دلانے والی آزادی کی ضرورت ہے۔ ایسی آزادی سرمایہ داروں کے لئے موت کا پیغام ہوگی۔ لیکن اس آزادی کو حاصل کرنے کے لئے ہمیں اپنی آواز سرمایہ داروں کے ساتھ ملانی نہیں چاہیے بلکہ اس کے لئے ہمیں جمہور کو سیاسی طور پر بیدار کرنا چاہیے۔ انہیں سمجھانا چاہیے کہ حقیقی آزادی کون سی ہے؟

(۴ جولائی ۱۹۴۳ء)

گاندھی ازم کی مخالفت کیوں؟

کشمیر سوشلسٹ پارٹی اور ینگ سوشلسٹ یونین کے ممبروں کو چھوڑ کر جن کی تعداد قلیل ہے کشمیر کے ہندو آج کل مجھ سے ناراض ہیں۔ وہ "ہمدرد" کے رویہ کو پسند نہیں کرتے ان کا خیال ہے کہ یہ ملک کی آزادی کے خلاف ہے اور قوم پرستی کے اصولوں کے منافی۔ اس ناراضگی میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو سوشلزم کو ایک رومانی کھیل سمجھتے رہے ہیں اور اسی لئے گاندھی جی کو بھی ایک سوشلسٹ مانتے رہے ہیں۔ وہ دوست بھی شامل ہیں جو کانگریس کو قوم پرستی کا اجارہ دار تسلیم کرتے رہے ہیں اور اسی لئے مسٹر محمد علی جناح کو گالیاں دیتے نہیں تھکتے۔ وہ لوگ تو پہلے بھی شامل تھے اور اب خم ٹھوک کر میدان میں آنکلے ہیں جو مہاسبھائی اور فرقہ وارانہ خیالات کے ہیں۔

فرقہ پرست ہندوؤں کے ساتھ میری نہ پہلے کبھی بنی تھی نہ اب بن سکتی ہے۔ لیکن وہ لوگ جو میرے ساتھ بحیثیت قوم پرست پہلے اتفاق کرتے تھے اور اب مجھے کانگریس اور گاندھی جی کے اعمال پر کڑی نکتہ چینی کرتے دیکھتے ہیں ان کی ناراضگی کی حد بہت ہی بڑھ گئی ہے۔ ان میں سے کئی دوست مجھے خطوط لکھتے رہتے ہیں یا کبھی کبھی ملنے کی تکلیف بھی گوارا فرماتے ہیں۔ یہ احباب اکثر فرماتے ہیں کہ آپ نے ہی پچھلے دس سالوں سے اس ملک میں گاندھی جی اور گاندھیّت کا پرچار کیا۔ آپ ہی ان کو اوتار مانتے تھے اور ہندوستان کانجات دہندہ سمجھتے تھے۔ اب آپ ہی گاندھیت کی دھجیاں فضائے آسمانی میں بکھیر رہے ہیں۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ یہ متلون مزاجی ہے اور ہمارے دلوں میں شکوک پیدا کرنے کے لئے کافی ہے؟ ہم کس طرح یک لخت مان لیں کہ وہ مہاتما جی جن کے خلاف کل تک آپ ایک لفظ سننا بھی گوارا نہ کرتے تھے آج اس آزادی کے خلاف عمل کر رہے ہیں جو ہم سب ہندوستانیوں کا نصب العین ہے۔ گاندھی جی کے متعلق یہ کہنا کہ وہ اپنے آدرش سے گر گئے بہت مشکل ہے۔ لیکن یہ تسلیم کرنا آسان ہے کہ آپ نے کسی خصوصی مصلحت کی بناء پر درست راستے کو چھوڑ دیا ہے۔"

ہندوستان کے لوگ اپنے رہنماؤں کو پوجتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ وہ چند عقائد اور اصولوں کو پھیلا رہے ہیں بلکہ صرف اس لئے کیونکہ وہ مشہور ہیں۔ بزرگ ہیں اور مانے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی قوم پرست جب کبھی دیکھتے ہیں کہ ان کے لیڈروں پر نکتہ چینی ہونے لگی۔ تو وہ آپے سے باہر ہوجاتے ہیں۔ میرے دوستوں کی ناراضگی کی بھی یہی وجہ ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ گاندھی جی اور میرے درمیان جو تعلقات تھے وہ اسی قسم کے تھے۔ میں گاندھی جی کو ایک رہنما بزرگ اور مشہور ہستی ہونے کی وجہ سے پوجتا تھا جیسا کہ آج بھی وہ رہنماء بزرگ اور مشہور ہستی کی حیثیت سے بدستور قائم ہیں۔ تو میں نے کیوں ان کو پوجنا چھوڑ دیا۔ بات یہ نہیں۔ میں گاندھی جی کو اس لئے رہنما مانتا تھا کہ مجھے یقین تھا کہ وہ ہندوستان کے سماجی اور سیاسی انقلاب کو فروغ دے رہے ہیں۔ وہ ہندوستانی عوام کو آزاد کرنے کا جھنڈا اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے ہیں۔ ان کے عقائد اور اصول بلند ہیں اور وہ ان عقائد اور ان اصولوں کے ترجمان ہیں۔ اگر واقعات نے مجھے یہ سمجھنے پر مجبور کیا کہ مہاتما جی ان اصولوں اور ان عقائد کے الٹ جا رہے ہیں تو میں ان کو ہندوستان کے سیاسی اور سماجی انقلاب کا ترجمان اور علمبردار ماننے سے کیوں منکر نہ ہوجاؤں؟ میں نے گذشتہ ایک سال سے اپنے مضامین میں صاف دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کانگریس ان کے زیر اثر آہستہ آہستہ رجعت پسندی کی طرف چل رہی ہے اور گذشتہ اگست میں جو تحریک انہوں نے شروع کردی تھی اس کا مدعا اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ہندوستان کو دنیا کے اس سماجی اور سیاسی انقلاب سے علیحدہ کردیا جائے جو بنی نوع انسان کی آزادی کے لئے اشد ضروری ہے اور جس کو سوشلزم کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اب اپنے اعمال اور عقائد کی بدولت ہندوستانی سرمایہ داروں کے ترجمان ہوگئے ہیں اور ان کے مفاد کو محفوظ رکھنے کے لئے لڑ رہے ہیں جب تک کانگریس ہندوستان کو برطانوی سامراج سے آزاد کرنا چاہتی تھی اور جب تک اس حیثیت سے مہاتما جی کانگریس کے لیڈر تھے ہمارا فرض تھا کہ ان کے پیچھے پیچھے چلیں۔ لیکن جب انہوں نے اس تاریخ کام کو چھوڑ کر کھلے بندوں ہندوستانی سرمایہ داروں کی رہنمائی کا بیڑا اٹھایا تو انقلاب پسندوں کا فرض ہے کہ وہ ان کے نئے پروگرام کی مخالفت کریں۔ ہمارے معترضین کو یہ اچنبھا دکھائی دیتا ہے کہ ایک شخص جو اس جنگ کی ابتداء تک ہندوستان کی آزادی کے لئے لڑ رہا تھا' وہ انجمن جو ہندوستانی جمہور کی آزادی کی ترجمان تھی

کیونکر اپنے اس پروگرام اور ان عقائد سے منحرف ہوگئی۔ یہ کوئی تعجب کا مقام نہیں اور اس پر وہی لوگ حیران ہوسکتے ہیں جو تاریخ کے مختلف انقلابوں سے واقف نہیں۔ تاریخ میں کئی دفعہ کئی جماعتوں اور کئی شخصیتوں کا یہ حال ہوتا رہا ہے کہ وہ ایک خاص مرحلے تک انقلاب کو فروغ دینے کا کام دیتی رہیں لیکن اس مرحلے سے آگے نہ جا سکیں۔ اور پھر خود ہی مخالف انقلاب بن گئیں۔ بہت کم لوگوں اور انجمنوں کے نصیب ایسے ہیں کہ وہ انقلاب کو فروغ بھی دیں اور اس کو آخری مرحلے تک لے جا کر کامیاب بھی ہوتا ہوا دیکھیں۔ مہاتما جی نے ہندوستانی انقلاب کے لئے کام کیا۔ لیکن اب اپنے فلسفہ حیات کی وجہ سے وہ انقلاب کے نزدیک آنے کے وقت اس سے روگرداں ہوگئے اور انہوں نے انقلاب کے دشمنوں کا ساتھ دینے کا بیڑا اٹھایا مہاتما گاندھی کی گذشتہ تحریک (اگست ۱۹۴۳ء کی تحریک سے مراد ہے) کی کن لوگوں نے حمایت کی اگر ان کی فہرست پر نظر ڈالی جائے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ وہی سرمایہ دار اور فرقہ پرست ہندو ہیں جو پچھلے سالہا سال سے کانگریس کی برابر مخالفت کرتے آئے ہیں۔ موجودہ بین الاقوامی انقلاب سے پیشتر ان میں سے اکثر لوگ کانگریس کے مخالف تھے لیکن آج اس کے حمایتی بن گئے ہیں حالانکہ انقلاب سے قبل ان لوگوں کو کانگریس سے خوف نہ کھانا چاہیے تھا اور آج جب کہ انقلاب ہمارے سروں پر منڈلا رہا ہے ان کو اس جماعت سے اگر یہ سچ مچ جمہور کی نمائندہ ہوتی خوف کھانا چاہئے تھا لیکن دیکھئے کتنا اچنبھا ہے کہ آج تک یہ لوگ اس انجمن کی مخالفت کرتے رہے لیکن آج اس کے گن گا رہے ہیں۔ کیا یہ معنی خیز نہیں کہ گاندھی جی کی رہائی کے لئے آجکل تمام سرمایہ دار، مالکان کارخانہ جات، ہندو مہا سبھائی، لبرل چیمبر آف کامرس، بیوپار منڈل اور ایسے ہی دوسرے ادارے زور دے رہے ہیں؟ یہی وہ لوگ تھے جو کانگریس کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے کہ کانگریس نے کیوں مکمل آزادی کا اعلان کیا۔ انہوں نے اس کے مقابلے میں ہمیشہ درجہ نو آبادیات کے مطالبہ پر زور دیا۔ لیکن آج جب گاندھی جی انگریزوں کو بالکل باہر نکال کر ہندوستان کو پورن سوراجیہ دلانے کا دعوی کر بیٹھے ہیں یہ لوگ ان کی حمایت کر رہے ہیں۔ ان کو رہا کرانے کے لئے لاکھوں روپیہ پانی کی طرح بہانے پر تیار ہیں۔ کانگریس کو زندہ کرنے کے لئے بے قرار ہیں۔ کیا یہ لوگ دیکھتے دیکھتے انقلاب پسند ہوگئے۔ اور کیا اب انہیں کوئی ڈر باقی نہیں رہا؟ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ سرمایہ دار کبھی انقلاب پسند نہیں ہوسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اب ان

لوگوں کو پورا بھروسہ ہے کہ کانگریس نے انقلاب پرستی کا کام بالکل چھوڑ دیا۔ گاندھی جی نے جمہور کو انقلاب سے دور رکھنے کا بیڑا اٹھایا۔ وہ انقلاب کے دشمن ہوگئے۔ وہ بین الاقوامی انقلاب کے خلاف ہیں۔ اور ہندوستان کو اس سے بچائے رکھنے کی انتہائی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ جمہور کے بدلے سرمایہ داروں کے ترجمان ہیں - گاندھی جی نے (Policy Schorched Earth) یعنی ساڑ پھونک کی تحریک کے خلاف بھی جہاد کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ بھی اس پروگرام کی ایک شق تھی اور اگست کی تحریک بھی اس کا ایک بڑا بھاری جزو تھا۔

میں عقائد کا پجاری ہوں۔ شخصیتوں کا نہیں۔ جب تک مہاتما گاندھی اور کانگریس ہندوستانی انقلاب کے ترجمان تھے اور اس کو فروغ دینے کے لئے ایک پروگرام پر عمل کر رہے تھے تب تک میں ان دونوں کو پوجتا تھا جیسا کہ ہر ایک انقلابی کا فرض تھا کہ ان کو پوجے لیکن جب گاندھی جی کی رہنمائی میں کانگریس نے یہ تاریخی کام چھوڑ دیا۔ اور سرمایہ داروں کو ہندوستان حوالے کرنے کا فیصلہ کردیا۔ میں نے بھی ان دونوں سے منہ موڑا۔ ہمارے رومانی سوشلسٹ اور قوم پرست لکیر کے فقیر ہیں۔ اگر وہ بدلتے ہوئے حالات کا جائزہ لیتے رہتے تو ان کو نئے حالات مجبور کرتے کہ وہ کانگریس کو یا تو گاندھیت کے اثر سے بچائیں اور اس کو از سر نو صحیح راستہ پر لائیں۔ یا اگر ایسا نہیں کرسکتے (کیونکہ گاندھی پرست کانگریس پر برابر اپنا اثر و رسوخ برقرار رکھنا چاہتے ہیں اور اس کو فنا کرنا پسند کرتے ہیں۔ لیکن اپنی گرفت سے جانے نہیں دینا چاہتے۔) تو انقلاب پسندوں کی حیثیت سے ان کا تاریخی فرض ہے کہ وہ جمہور کی ترجمانی کے لئے اپنی نئی جماعت بناکر انقلاب لانے کے لئے سرگرم عمل رہیں۔ یہی ہماری جماعت کا کام ہے اور اس کے لئے ہم منظم ہونا چاہتے ہیں۔ میں گاندھیت کو ہندوستان کی جمہوری آزادی کے لئے ایک بڑی بھاری رکاوٹ سمجھتا ہوں میری پختہ رائے ہے کہ جب تک ہندوستان کے ہندو نوجوان گاندھیت کے اثر میں رہیں گے ہمارا وطن کوئی ترقی نہ کرسکے گا۔ گاندھیت کے اندر فرقہ پرستی کے عناصر موجود ہیں۔ گاندھیّت پر چلنے سے انسان مذہب کو سیاسیات کے ساتھ خلط ملط کردیتا ہے فرقہ پرستی کی دلدل پیدا ہوجاتی ہے اور گاندھیت کا پیرو اس میں بری طرح پھنس جاتا ہے۔ اس لئے میری رائے ہے کہ جب تک ہندوستان میں گاندھیت ہے فرقہ پرست بھی موجود رہے گی۔ جب ہم اپنی

سیاسیات کو مذہب سے علیحدہ کریں گے جب کانگریس کا پلیٹ فارم برہمچریہ اہنسا اور ستیہ گرہ جیسی غیر سیاسی باتوں کی بحث و مباحثہ کے لئے بند ہوگا۔ اور اس پلیٹ فارم پر صرف ملک کے سیاسی اور اقتصادی مسائل پر ہی بحث ہوا کرے گی۔ اور ہم آزادی کی طرف چلنا شروع کریں گے۔ ظاہر ہے کہ گاندھیت ہمیں ایسا کرنے نہیں دے گی کیونکہ گاندھیت سے اگر اخلاقی اور مذہبی باتوں کو نکالا جائے تو اس کا کچھ پروگرام ہی باقی نہیں رہتا اور یہ بے جان لاش ہوکر رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بالاخر گاندھیت میں مذہب زدہ ہندوؤں کے بغیر کسی دوسرے ہندوستانی فرقے کے لئے کوئی کشش باقی نہ رہی۔ ہندو بھی اس کو صرف اس لئے پسند کرتے ہیں کہ ان میں ان کے بوسیدہ تہذیب و تمدن کو ازسرنو زندہ کرنے کے آثار نظر آتے ہیں۔ اور یہ پس ماندہ قوموں کی علامت ہے کہ وہ اپنے مستقبل کو شان دار بنانے کے بجائے ماضی کی تعریفیں کرتے رہتے ہیں اور اس کو اچھا مانتے ہیں۔ ہندوستان کے ہندو بھی پس ماندہ ہیں اور مسلمان بھی۔ ہندو گاندھیت میں اپنے ماضی کی شان دیکھتے ہیں مگر مسلمان کچھ بھی نہیں دیکھتے اس لئے ہندو اس کو پسند کرتے ہیں اور مسلمان ناپسند۔

ہندو قوم پرست اکثر گلہ کرتے رہتے ہیں کہ مسلمان فرقہ پرست ہیں۔ ان لوگوں نے قوم پرستی صرف گاندھیت کے حق میں کہنا سمجھ رکھا ہے۔ یہ لوگ نہیں دیکھ سکتے کہ مسلمان جب تک وہ مسلمان ہے گاندھیت کا پیرو نہیں ہوسکتا۔

مجھے پورا یقین ہے کہ اگر ہندوستان کو آزاد ہونا ہے اگر اس آزادی کے لئے ضروری ہے کہ ہندو اور مسلمان اکٹھے ہوں۔ اور ہندوستانیوں کی مجموعی ذہنیت ترقی پسندانہ ہوجائے۔ وہ دنیا کی ترقی یافتہ اور تہذیب یافتہ قوموں کی صف میں آجائے تاکہ اس ملک کے جمہور بھی انسانوں کی سی زندگی بسر کرسکیں۔ وہ بھی سائنس کی پیدا کردہ نعمتوں سے بہرہ اندوز ہیں۔ تو ہمیں سب سے پہلے اس فلسفہ حیات کی مخالفت کرنی چاہیے جس نے ہمیں اس راستہ پر جانے سے روک رکھا ہے اور وہ فلسفہ حیات میری رائے میں گاندھیت ہے۔ گاندھی ازم ہندوستان میں صحیح سیاسیات کو پنپنے نہیں دیتا۔

(۲۰ جون ۱۹۴۳ء)

ہندوستان کی اشتراکی جماعتیں

ہندوستان میں اشتراکیت پسندوں کی تین جماعتیں ہیں۔
کانگریس سوشلسٹ پارٹی
کمیونسٹ پارٹی اور
ریڈیکل ڈیموکریٹک پارٹی۔

تینوں کارل مارکس کو اپنا گورو مانتی ہیں اور تینوں روس اور اس کے اشتراکی نظام کے حمایتی ہونے کا دعوی کرتی ہیں لیکن جہاں تک ہندوستان کی آزادی کے مسئلے کا تعلق ہے تینوں کا پروگرام علیحدہ علیحدہ ہے۔ اس لئے عمل سے یہ تینوں پارٹیاں ایک دوسرے کے سخت مخالف ہیں۔

جنگ سے قبل ہندوستان کا سیاسی سٹیج کانگریس کے قبضے میں تھا۔ کانگریس کو مسلمہ طور پر ملک کی آزادی کے لئے لڑنے والی سب سے بڑی تنظیم مانا جاتا تھا۔ اس لئے یہ تینوں پارٹیاں کانگریس کے اندر رہ کر اپنے اپنے نظریے اور پروگرام کے مطابق کام کررہی تھیں۔ اس وقت ان تینوں کی آواز نحیف تھی۔ کمیونسٹ پارٹی خلاف قانون ہونے کی وجہ سے کھلے بندوں کام بھی نہ کرسکتی تھی ریڈیکل ڈیموکریٹک پارٹی منظم طور پر منظر عام پر نہ آئی تھی۔ اس کے ممبر عام کانگریسیوں کی حیثیت میں تھے۔ چند سالوں سے صرف کانگریس سوشلسٹ پارٹی باضابطہ کام کررہی تھی اور اس کا نام اخباروں میں پڑھا جاتا تھا۔

جب موجودہ جنگ کے شروع ہونے سے سیاسیات عالم میں بحران آگیا اور ہندوستان میں بھی حالات غیر معمولی صورت اختیار کرنے لگے تو ان پارٹیوں نے اپنی اپنی تنظیم کو استوار اور مستحکم بنانا شروع کردیا۔ ابتداء سے ہی علیحدہ علیحدہ نظریے ہونے کی وجہ سے بین الاقوامی بحران آنے پر بھی اشتراکیت پسندوں کی یہ پارٹیاں ایک دوسرے کے ساتھ نہ مل سکیں۔ انہوں نے پھر ایک دفعہ اپنا پروگرام الگ الگ بنایا۔ کانگریس سوشلسٹ پارٹی نے کانگریس۔ قوم

پرستوں کی حمایت کی۔ اور گاندھی جی کی تحریک کا مکمل طور پر ساتھ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ پارٹی اشتراکیت پروری کا دعوے کرتے ہوئے بھی کانگریسی قوم پرستوں میں جذب ہو گئی۔ کانگریسی سوشلسٹوں کا خیال تھا کہ جس طرح گذشتہ جنگ عظیم میں روس کے اندر انقلاب آیا اسی طرح ایک عوامی تحریک کے ذریعہ اس جنگ کے دوران میں ہندوستان کے اندر بھی انقلاب پیدا کیا جاسکتا ہے۔ اسی بات کو مدنظر رکھ کر اس پارٹی کے لیڈروں نے گاندھی جی کی تحریک کی حمایت کی۔ بتایا جاتا ہے کہ گذشتہ سال ماہ اگست سے دو تین مہینے تک ہندوستان کے اندر جو افراتفری رہی اس میں اسی پارٹی کا ہاتھ تھا۔ لیکن ہندوستان میں "انقلاب" بپا نہ ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کانگریس سوشلسٹ پارٹی کا نظریہ درست نہ تھا۔ وہ نہ دیکھ سکی کہ پچھلی جنگ عظیم اور اس جنگ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اور جو کچھ آج سے پچیس سال قبل روس میں ہوا تھا اس کو اب دہرایا نہیں جاسکتا۔ کیونکہ بین الاقوامی حالات بدل چکے ہیں اور یہ جنگ خود ہی ایک انقلاب ہے۔ کانگریس سوشلسٹ پارٹی نے اہم غلطی کر کے اپنے آپ کو ختم کردیا اور اس کے لیڈر آج کل جیلوں میں بند ہیں۔

کمیونسٹ پارٹی نے اگست کی کانگریسی تحریک کے وقت جرات سے کام لے کر افراتفری کی زبردست مخالفت کی۔ عوام کو اس سے بچائے رکھنے کی انتہائی کوشش کی۔ یہ بتا کر ہندوستان کے جمہور کی درست رہنمائی کی کہ موجودہ جنگ دنیا کے عوام کی جنگ ہے۔ فاشزم جمہور کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ اور اس کا فاش کرنے سے ہی انسانی سماج آزاد ہوگا اور ترقی کرے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی کمیونسٹ پارٹی نے کانگریسی لیڈروں کی ہردلعزیزی کے خوف سے موقعہ پرستی کی آڑ لی۔ اور بجائے اس کے کہ اتحادیوں کی غیرمشروط طور پر امداد کرتے انہوں نے عوام کے سامنے اپنی نیک چلنی کا ثبوت پیش کرنے کے لئے چند نامناسب اقدام کئے۔ انہوں نے روس کے حق میں آواز بلند کی۔ لیکن روس کے اتحادیوں اور خاص کر انگریزوں کی مخالفت بھی کی۔ جب کانگریس نے اگست کی تحریک شروع کی تو پارٹی نے اس تحریک کی مخالفت بھی کی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی کانگریسی لیڈروں کی تعریف بھی کرتے رہے اور ان کو جیل میں ڈالنے کے لئے حکومت کی مذمت بھی کرتے رہے۔ گاندھی جی اور دوسرے کانگریسی لیڈروں نے اگست کی تحریک کو چلا کر یا تو اچھا کیا یا برا کیا۔ اگر اچھا کیا تو دیش بھگتوں کا فرض تھا کہ ان کی پوری حمایت کرتے۔ لیکن اگر برا کیا تھا تو ان کو لیڈر کہنا یا

ان کی خطرناک رہنمائی پر پردہ ڈالنا ہندوستان کے جمہور کے ساتھ غداری تھی۔ کمیونسٹوں نے تحریک کی پرزور مذمت کی۔ لوگوں کو اس میں شریک ہونے سے باز رکھا۔ لیکن پھر بھی گمراہ عوام کو خوش کرنے کے لئے مہاتما جی اور دوسرے کانگریسی لیڈروں کی تعریف کرتے رہے۔ اور حکومت برطانیہ سے ان کی رہائی کے لئے لڑتے رہے۔ ظاہر ہے کہ ان باتوں میں تضاد موجود تھا اور اس قسم کے پرچار سے کمیونسٹ پارٹی نے ہندوستانی عوام کے دماغ میں الجھن پیدا کردی۔ ایک معمولی عقل کا آدمی بھی دیکھ سکتا تھا کہ کمیونسٹ پارٹی غلط رہنمائی کر رہی ہے۔ اس جنگ میں روس کی حمایت کرنا بے معنی بن جاتا ہے۔ جب اس کے ساتھ ہی روس کے اتحادیوں کی مخالفت کی جائے۔ اسی طرح کانگریس تحریک کی مخالفت کرنا بھی بے معنی بن جاتا ہے جب کانگریسی لیڈروں کو قوم کے سچے رہنما تسلیم کیا جائے۔ ہندوستانی کمیونسٹوں کی اس موقعہ پرستی اور غلط رہنمائی کے خلاف ریڈیکل ڈیموکریک پارٹی کے ممبر بار بار شکایت کرتے رہے۔ انہوں نے دکھایا کہ کمیونسٹوں میں انقلابی جرات موجود نہیں اور وہ قوم پرستوں سے گھبراتے ہیں۔ اسی لئے اشتراکیت پسندی کے تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر موجودہ بین الاقوامی بحران میں ہندوستانی جمہور کو غلط راستے پر لگا رہے ہیں۔

ریڈیکل ڈیموکریٹک پارٹی کا نظریہ بالکل صاف تھا۔ وہ کہتے تھے کہ اس جنگ میں انسان غیر جانب دار نہیں رہ سکتا۔ وہ یاتو فاشسٹوں کا طرفدار رہ سکتا ہے۔ یا جمہوریت پرستوں کا اس لئے جو شخص چاہتا ہے کہ روس جیت جائے۔ دنیا میں اشتراکی خیالات پھیل جائیں اور جمہوریت کی فتح ہو اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ اتحادیوں کی امداد کرے۔ ریڈیکل ڈیموکریٹک پارٹی کے ممبر کمیونسٹوں کی اس بات کو طفلانہ مانتے ہیں کہ ہندوستانیوں کو روس کی تو امداد کرنی چاہیے لیکن برطانیہ کی مخالفت۔ وہ سمجھتے تھے کہ برطانیہ کی مخالفت کرنے سے ہندوستانی اس جنگ میں روس کو ہی سراسر نقصان پہنچا رہے ہیں۔ کامریڈ شالین نے اپنی کئی تقریروں میں ریڈیکل ڈیموکریٹک پارٹی کے نظریہ کی بلا واسطہ حمایت کی۔ انہوں نے بار بار بتلایا کہ یہ جنگ ناقابل تقسیم ہے۔ ایک طرف فاشسٹ ہیں اور دوسری طرف جمہوریت پسند۔ ایک انسان یا تو فاشسٹوں کی مدد کرسکتا ہے یا جمہوریت پسندوں کی۔ اس کے بغیر دوسرا کوئی راستہ نہیں۔

اس جنگ میں اتحادیوں کو غیر مشروط طور پر امداد دینے کا مطلب ہرگز یہ نہ سمجھنا چاہیے

کہ ہم اتحادیوں اور خاص کر برطانیہ کی ہر حرکت کو حق بجانب سمجھتے ہیں اور اس کے ہر اقدام سے متفق ہیں۔ ہمیں حکومت برطانیہ کی کئی باتوں سے اختلاف ہے۔ لیکن جہاں تک فاشزم کے خلاف جنگ کا تعلق ہے ہر ایک آزادی خواہ کو چاہیے کہ اس کی مکمل طور پر حمایت کرے۔

ان حالات کے اندر ہم سمجھتے ہیں کہ موجودہ بین الاقوامی بحران میں ریڈیکل ڈیموکریٹک پارٹی کا بول بالا ہوا ہے۔ واقعات نے ثابت کردیا کہ اس کی رہنمائی درست ہے۔ اس پارٹی کے ممبروں نے ابتداء سے ہی عوام کو کہا کہ اگر دنیا میں سوشلزم کی فتح چاہتے ہو تو غیر مشروط طور پر اتحادیوں کو مدد دو۔ ریڈیکلوں نے کوشش کی تھی کہ انڈین نیشنل کانگریس بھی اس نظریہ کی موید بن جائے لیکن گاندھی جی کے فلسفہ حیات نے ہندوستان کو اشتراکیت کی طرف جانے نہ دیا اس لئے ریڈیکل پارٹی نے کمال اخلاقی جرات سے کام لے کر ان کی مخالفت کی۔ اس سے ریڈیکل بہت غیر ہردلعزیز بن گئے۔ لیکن وہ کمیونسٹوں کی طرح اس غیر ہردلعزیزی سے خوفزدہ نہ ہوئے۔

اب حالات بدل رہے ہیں۔ ریڈیکل ڈیموکریٹک پارٹی کا نظریہ سچا ثابت ہورہا ہے۔ تعجب نہ ہوگا اگر آنے والے دور میں یہی پارٹی برسراقتدار آکر ہندوستانیوں کی رہنمائی کرے۔

(۲۸ مئی ۱۹۴۳ء)